Regd. No. L-1781 FORTNIGHTLY Phone 72948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow. (India)

مکتبہ دارالعلوم کی دوسری مطبوعات

مسئلہ ختم نبوت ۔ علم وعقل کی روشنی میں

تالیف: مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

اس کتاب میں مسئلہ ختم نبوت کو محکوس علمی وتحقیقی انداز میں ثابت کیا گیا اور عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور ضرورت کو خالص علمی وعقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے، ہر صاحب عقل سلیم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد ختم نبوت کا قائل ہو جائیگا، قادیانیت کے طلسم میں گرفتار اور عقیدۂ ختم نبوت میں شک وشبہ کرنیوالے افراد کے حق میں یہ فاضلانہ تصنیف روشنی کا ایک عظیم مینار ہے!

قیمت:- ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے

منثورات

از مولانا یحییٰ نعمانی

اس کتاب میں مصنف نے ان جاندار مضامین کا انتخاب کیا ہے جو زبان کے تحفظ اسلام کی بدولت کیساتھ ہی ساتھ ملی تحریک کا کام بھی دے سکتے ہیں اور اسلامی جذبات پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں، سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور مستند وصاحب طرز انشاء پردازوں کی نثر کے نمونے پیش کئے گئے ہیں جو عربی زبان وادب کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں نثر قدیم کے ساتھ نثر جدید اور نظم قدیم بھی شامل ہے، مدارس عربیہ کی بڑی تعداد نے نصاب میں داخل کیا ہے۔

قیمت :-

جزیرۃ العرب

از مولانا محمد رابع ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

یہ تحفہ فضیل کوئی خشک کتاب نہیں بلکہ اس میں سیرت، تاریخ، ادب، جغرافیائی اہمیت کیساتھ دینی اور ادبی اہمیت بھی خوبیوں کے ساتھ سمائی ہے۔ اس سلسلہ میں قدیم وجدید دونوں ماخذ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اہم مقامات کے قدیم وجدید ناموں کیساتھ جدید نام بھی بتائے گئے ہیں اور جا بجا وضاحتی نقشے بھی دیئے گئے ہیں، اسکا تذکرہ عالم عربی کے اخبارات نے اچھے الفاظ میں کیا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں بھی داخل ہے، اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب۔ قیمت ۵ روپیہ

دہلی اور اسکے اطراف

از مولانا حکیم سید عبدالحی الحسنی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء

یہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے جو انیسویں صدی کے اخیر میں لکھا گیا تھا اس سفرنامہ سے اندازہ ہوگا کہ گذشتہ صدی کے علماء کس ثقاہت اور علم کے حامل تھے اور ان کا مطالعہ کتنا وسیع، تفقہ اور تبحر تھا، اس کے اس سفرنامہ میں شعوب فن کا وقیع تعلیم، الٰہی تاریخی واقفیت، سلاسل تصوف اور انکی شاخوں اور تسرس پر اطلاع، متقدمین کی تصنیفات اور کتابوں سے آگاہی اور ان کے مسلک اور عہد کے نشانات جا بجا ملیں گے قیمت مجلد ۴ روپیہ

حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

از مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی

چودھویں صدی ہجری کے مشہور ومقبول بزرگ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی سوانح عمری، حالات، ارشادات و ملفوظات صدہا دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتے اور عام سلسلوں کے تصوف، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ عین شریعت کی روح ہے، وہ حضرات محمد ومحبت کے جویا اور یقین کے طالب ہیں ان کیلئے یہ کتاب بیش قیمت تحفہ ہے۔

قیمت عہ

معلم الانشاء

از مولانا عتیق الماجد صاحب ندوی ومولانا محمد رابع صاحب ندوی

انشاء تمام زندہ زبانوں کا اہم عنصر ہے موجودہ مہجوری دور اور صحافتی ومجلسی زندگی نے اسکو روز افزوں گرویدہ بنا دیا ہے، دعوت وتبلیغ کے تقاضوں، ملکوں اور قوموں کے ارتباط وتعلق کی صورت اختیار کی اور ادبی لگاؤ وچاہت بھی بخش دی جو ہر زبان کے ارتقاء کا ضامن ہے، اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ان کے طلبہ کیلئے اس سلسلے کی ترتیب دی ہے جو عربی مدارس ندوہ کی چوتھی جماعت سے لیکر عربی مدارس میں تعلیم وانشاء کا نصاب بن سکے۔ حصہ کتابت وطباعت سیارہ۔ حصہ اول از مولانا عبدالماجد الحاجہ ندوی، قیمت ۱/۷۵

حصہ دوم (" " " ") " ۱/۶۲

حصہ سوم (مولانا محمد رابع ندوی) " ۲/۵۰

الادب العربی

بسین عرض ونقد

از مولانا سید محمد رابع ندوی۔ ادیب اول دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

عربی ادب کی تاریخ اور تنقید کے موضوع پر ہندوستان میں یہ پہلی کوشش ہے جو اردو یا انگریزی میں عرض ونقد کے نام سے عربی زبان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پیش کی ہے۔

اس کتاب میں عربی ادب کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے اور یہ تین بڑے حصوں پر مشتمل ہے

ادب کی حقیقت ۲ تنقید وتجزیہ ۳ ادبی نمونے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ خوبصورت عربی ٹائپ پر یہ کتاب چھپ کر آگئی ہے

(قیمت صرف چار روپے)

Cover Printed at NADWA Press, Lucknow

تعمیر حیات

شہ عبہ تعمیر وترقی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

★ ۲۶ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ ★ مطابق ۱۰ ستمبر ۱۹۶۹

★ چندہ سالانہ آٹھ روپیہ ★ قیمت فی پرچہ ۳۵ پیسے

ایڈیٹر ۔۔۔ سید محمد الحسنی

معاون ۔۔۔ سعید الاعظمی ندوی

مسجد اقصیٰ کی بازیابی کیلئے مثبت اور مضبوط اقدام کی ضرورت

۲۸ اگست کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بیت المقدس میں دیدہ ودانستہ آتش زنی کی مذمت کے لئے احتجاجی جلسہ ہوا جس میں تمام طلبہ اور اساتذہ نے شرکت کی، ماسٹر عبدالسمیع صاحب اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے جلسہ کو خطاب فرمایا (مولانا کی تقریر اندر کے صفحات میں دی جارہی ہے) مولانا سید محمد رابع حسنی کی پیش کی ہوئی مندرجہ ذیل احتجاجی تجویز منظور ہوئی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کا یہ جلسہ بیت المقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے خلاف اپنے انتہائی غصہ وکرب کا اظہار کرتے ہوئے مسجد اقصیٰ میں حالیہ لگائی جانے والی آگ کو ایک سوچی سمجھی ہوئی سازش سمجھتا ہے اور یہ رائے رکھتا ہے کہ اگر مسلمانان عالم خصوصاً مسلمان ممالک کے حکمرانوں نے اس واقعہ پر کوئی مثبت اور طاقت ور قدم نہیں اٹھایا تو مسجد اقصیٰ نیز اس کے اردگرد کے تمام مقدس مقامات اسرائیل کے ناپاک ارادوں کا مکمل شکار بن سکتے ہیں، جس کے نتیجہ میں فلسطینیوں کی مقدس سرزمین کے تقدس کو ناقابل تلافی نقصان پہونچیگا۔ بیت المقدس وہ جگہ ہے جس کے تقدس اور عظمت کو تمام آسمانی مذاہب یکساں طریقہ سے تسلیم کرتے ہیں، اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری ان تمام مذاہب کے ماننے والوں پر خواہ وہ کہیں کے بھی رہنے والے ہوں واجب ہے، لیکن مسلمانوں پر اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے کیونکہ اب صدیوں سے وہی ان مقدس مقامات کے متولی اور امین رہے ہیں، اور انھوں نے ان کی مناسب اور صحیح خدمت اور حفاظت کی ہے اور انہیں سے اسرائیل نے اس مقدس ورثہ کو غصب کیا ہے، چنانچہ یہ جلسہ تمام مسلمانوں کو اس مقدس ذمہ داری کی طرف خاص طور پر متوجہ کرتا ہے اور ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اسرائیل کے غاصبانہ قبضہ کے ازالہ کے لئے جو خدمت انجام دے سکتے ہوں بغیر تاخیر کے انجام دیں یہ جلسہ جہاد سمجھتا ہے اور یہ جلسہ اپنی ہندوستانی حکومت سے بھی درخواست کرتا ہے کہ وہ اپنے سیاسی اور سفارتی ذرائع سے مغربی طاقتوں پر (کہ جن کی نگرانی میں اسرائیل نے یہ غاصبانہ کاروائیاں کی ہیں) زور ڈالے کہ وہ یہودی غاصبوں کو مقدس فلسطین جلد از جلد چھوڑ کر اپنی سابقہ حالت پر واپس جانے پر مجبور کرے تاکہ یہ مقدس مقامات اپنے صحیح اور جائز متولیوں کو واپس مل سکیں اور پھر ان کی صحیح حفاظت ہوسکے۔

یہ جلسہ عرب مسلمانوں اور ان کی ان حکومتوں کی کوشش کو بھی سراہتا ہے جو اسرائیل کی غاصبانہ کارروائیوں کے خلاف اور ان کے تدارک کے لئے انجام دے رہی ہیں ان کی کوششوں کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنے ضروری تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

نیز حجاز ونجد کے فرماں روا شاہ فیصل کی کوششوں کو خاص طور پر سراہتا ہے اور اس سلسلہ میں اسلامی چوٹی کانفرنس کے لئے ان کی دعوت کی پوری طرح تائید کرتا ہے۔

Rged No L 1981 FORTNIGHTLY Phone 22
TAMEER-E-HAYAT
Darululoom Nadwatululama, Lucknow. (India)

مکتبہ دارالعلوم کی دوسری مطبوعات

مذہب اور سائنس

از مولانا محمد رابع ندوی

اس کتاب میں مصنف نے ان جاندار دلائل کا انتخاب کیا ہے جو زبان کے کمال، دلکشی کی بلاغت کیساتھ دین وعقائد حقیت کا کام بھی دے سکتے ہیں اور اسلامی جذبات پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوسکتے ہیں، سیرت نبوی، تاریخ اسلام اور مستند وصاحب طرز ارشاد پر دلائل کی تفریح کے نمونے پیش کئے گئے ہیں جو عربی زبان وادب کی بہترین نمائندگی کرتے ہیں نثر قدیم کے ساتھ نثر جدید اور نظم قدیم بھی شامل ہے، مدارس عربیہ کی بڑی تعداد نے داخل نصاب کیا ہے۔

قیمت ۔ ۔ ۔

مسئلہ ختم نبوت علم وعقل کی روشنی میں

تالیف: مولانا محمد اسحاق صاحب سندیلوی ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

اس کتاب میں مسئلہ ختم نبوت کو محکم علمی وتحقیقی انداز میں ثابت کیا گیا اور عقیدہ ختم نبوت کی اہمیت اور ضرورت کو خالص علمی وعقلی دلائل سے واضح کیا گیا ہے، ہر صاحب عقل سلیم اس کتاب کے مطالعہ کے بعد عقیدہ ختم نبوت کا قائل ہوجائیگا، قادیانیت کے طلسم میں گرفتار اور عقیدہ ختم نبوت میں شک وشبہ کرنیوالے افراد کے حق میں یہ نامنلانہ تصنیف روشنی کا ایک عظیم مینار ہے!

قیمت:- ۲ روپے ۷۵ نئے پیسے

جزیرۃ العرب

از مولانا محمد رابع ندوی، استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء

یہ جغرافیہ کی کوئی خشک کتاب نہیں بلکہ اس میں سیرت، تاریخ وادب کی بھی پوری پوری نظر رکھا گیا ہے، اسکی دینی اور ادبی اہمیت بھی لوگوں کے سامنے آجاتی ہے، اس سلسلہ میں قدیم وجدید مصادر سے استفادہ کیا گیا ہے، اہم مقامات کے قدیم وجدید ناموں کیساتھ جدید نام بھی بتلائے گئے ہیں اور جگہ جگہ وضاحتی نقشے بھی دیئے گئے ہیں، ادارۃ المعارف عربی کے انتہارات نے اچھے انداز میں کیا ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں بھی داخل ہے اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب۔ قیمت ۵ روپیہ

تذکرہ

حضرت مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

از مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

چودھویں صدی ہجری کے مشہور ومقبول بزرگ رائے بریلوی نزیل حضرت مولانا فضل رحمٰن رحمۃ اللہ علیہ مراد آبادی کی سوانح حیات، حالات، ارشادات و ملفوظات جو دل پر اثر کئے بغیر نہیں رہتے اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تصوف، شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں بلکہ شریعت کی روح ہے، وہ حضرات جو صدق ومحبت کے جویا اور یقین کے طالب ہیں ان کیلئے یہ کتاب بیش قیمت تحفہ ہے۔

قیمت عہ

دہلی اور اسکے اطراف

از مولانا عبدالقیوم حقانی رحمۃ اللہ علیہ

یہ مصنف رحمۃ اللہ علیہ کا ایک سفرنامہ اور روزنامچہ ہے جو انیسویں صدی کے اخیر میں لکھا گیا تھا اس سفرنامہ سے اندازہ ہوگا کہ گذشتہ صدی کے علماء کس ثقاہت اور علم کے حامل تھے اور ان کا مطالعہ کتنا وسیع، تبحر اور پختہ تھا، آپ کو اس سفرنامہ میں شہر دہلی کا ذوقی سیر، علمی تاریخی واقفیت، سلاسل تصوف اور انکی خانقاہوں اور قبرستان پر اطلاع، متقدمین کی تصنیفات اور کتابوں سے آگاہی اور ان کے مسلک اور عہد کے نشانات جابجا ملیں گے۔ تحت نظر عربیہ

معلم الانشاء

از مولانا عبدالماجد صاحب ندوی ومولانا محمد رابع صاحب ندوی

انشاء تمام زندہ زبانوں کا اہم مضمون ہے، موجودہ جمہوری دور اور صحافتی وعملی زندگی نے بلکہ اہمیت کو دوبالا کردیا ہے، دعوت وتبلیغ کے تقاضوں، ملکوں اور قوموں کے ارتباط وتعلق نے اسکو نہ صرف اجتماعی وادبی بلکہ دینی اہمیت بھی بخش دی ہے، چنانچہ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے وقت کی اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ان کے ایک ایسے سلسلے کی ترتیب دی ہے جو عربی مدارس کے اساتذہ کی پوری نہایتی کرسکے اور عربی مدارس میں تعلیم وانشاء کا نصاب بن سکے۔

کاغذ کتابت وطباعت معیاری۔ حصہ اول (مولانا عبدالماجد ندوی) قیمت ۱/۷۵

حصہ دوم (" " ") " ۲/۶۲

حصہ سوم (مولانا محمد رابع ندوی) " ۲/۵۰

الادب العربی

بین عرض ونقد

از مولانا سید محمد رابع ندوی۔ ادیب اول (دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

عربی ادب کی تاریخ اور تنقید کے موضوع پر ہندوستان میں یہ سب سے پہلی کوشش ہے جو اردو زبان میں عرض ونقد کے نام سے عربی زبان میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے پیش کی ہے۔

اس کتاب میں عربی ادب کی تاریخ پر بحث کی گئی ہے اور یہ تین بڑے حصوں پر مشتمل ہے۔

ادب کی حقیقت ۔ تنقید وتجزیہ ۔ ادبی نمونے

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ خوبصورت عربی ٹائپ پر یہ کتاب چھپ کر آگئی ہے

(قیمت صرف چار روپے)

Cover Printed at NADWA Press. Lucknow

اسلام میں اخلاق کی اہمیت

از
محمد یٰسین
پورنوی

طالب کا صفحہ

انسانی زندگی میں اخلاق کی حیثیت ایک مرکزی قوت کی ہے وہ انسانیت اور حیوانیت کے درمیان وجہ امتیاز ہے، اور انسانوں کی اس چھپی ہوئی طاقت کا تعلق روحانیت سے ہے، انسانی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو بنیادی اخلاقیات کے بغیر پنپ سکے، جب تک اخلاقیات کو ملکی نظم وضبط میں عام نہ کیا جائے اس وقت تک کسی مضبوط تمدنی نظام کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔ اور عام زندگی میں اسے برتا نہ جائے تو اس کا اصلی جوہر کبھی کھل کر سامنے نہیں آسکتا، کیونکہ اگر عطر کو شیشی میں بند رکھا جائے تو اس کی خوشبو محسوس نہیں ہوسکتی، اس کی بھینی روح افزا تو بار بار ملنے ہلانے ہی سے پھیلتی ہے۔ اسی طرح اگر انسان دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرکے کسی گھاٹی میں اپنے آپ کو محبوس کرلے تو اس کا اخلاقی جوہر ہمیشہ کے لئے اس تاریک غار میں دفن ہوکے رہ جائے گا، انسان کا اخلاقی جوہر دوسری قوتوں کیطرح تصادم وکشمکش کے ذریعہ نمایاں ہوتا ہے۔ ایک شخص گھر میں ہے تو اہل وعیال کے تعلقات سے اس کے اخلاق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اگر بزم احباب میں ہے تو دوستوں کے اخلاق وارتباط کو اس کے اخلاق کا معیار بنایا جاسکتا ہے اگر وہ کسی بازار میں ہے تو معاملات کے ذریعہ اس کے عیب وہنر نمایاں ہوسکتے ہیں، خداوند قدوس نے انسان کو اخلاق کا مظہر بنایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اس میں صاف اعلان ہے کہ انسان بہترین خلقت ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اخلاق کی نمائش کے لئے ہی پیدا کیا ہے، ایک انسان کی حیثیت انسانیت اور ایک مسلمان کی حیثیت اسلامیت کا تصور بے معنی اور کھوکھلا ہوکر رہ جاتا ہے جب تک کہ اس کی بنیادیں اخلاق پر استوار نہ ہوں، اخلاق ہی ایک ایسی صفت ہے جو انسان اور انسانی روابط کو ہم آہنگ بنا سکتی ہے۔

اسلام ایک مکمل دستور حیات ہے اور ضابطۂ زندگی ہے۔ مذہب اسلام صرف چند رسمی عبادتوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے اور گوشے کے لئے ہدایت فراہم کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی "عبادت" ہے۔ آیت کریمہ ہے "وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون" (اور میں نے تو جنات اور انسان کو پیدا ہی اسی غرض سے کیا ہے کہ میری عبادت کریں) اس آیت کی تفسیر مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ کی زبانی سنئے۔ "عبادت سے یہاں مراد فقہ کی کتاب العبادات والی ہیچگانہ نہیں بلکہ اپنے وعام مفہوم میں طلب رضاء الٰہی کے مرادف ہے۔ امام رازیؒ نے کہا ہے کہ ساری عبادتوں کا خلاصہ صرف دو چیزیں ہیں، ایک امر الٰہی کی تعظیم دوسرے خلق اللہ پر شفقت، دوسرے لفظوں میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی"

مسلمانوں کا دین صرف مسجد تک محدود نہیں اور مسلمان ہونے کے یہ معنی نہیں کہ فرائض وواجبات دینیہ ادا کرنے کے بعد وہ اپنی عملی زندگی سے بالکل آزاد ہوجائے اور نہ اس کے اندر رہبانیت ہی کی اجازت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "لا رھبانیۃ فی الاسلام" بلکہ اسلام تو انسان کی پوری زندگی کو عبادت قرار دیتا ہے۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیل اخلاق ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق" یعنی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں تاکہ اخلاقی قدروں کو تمام وکمال تک پہونچاؤں، آپ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ دنیا میں ایک ایسا معاشرہ قائم کیا جائے جس سے تمام انسانوں کے اندر حسن اخلاق، اخوت ومحبت کی چاشنی پیدا ہو، چنانچہ آپ نے اپنے قول وعمل سے اچھے اخلاق کا ایسا نمونہ پیش کیا جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، آپ نے فرمایا کہ "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے" (حدیث) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضورؐ نے مجھے یمن بھیجتے وقت (گورنر بناکر) جو وصیت فرمائی تھی اس کے آخری کلمات یہ تھے کہ

"لوگوں کے ساتھ بہتر اخلاق سے پیش آنا" (حدیث)

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اخلاق کی تعریف اس طرح فرماتے ہیں وحسن الخلق خوش روی برتنے، مال (راہ خدا میں) خرچ کرنے اور دوسروں کو تکلیف نہ دینے کا نام ہے، امام غزالیؒ اخلاق کے متعلق لکھتے ہیں "انسان دو حصوں سے مرکب ہے ایک خلق (مراد ظاہری کیفیت) دوسرا خلق (مراد اندرونی ہیئت) جس طرح ظاہری اعضاء کے حسین اور موزوں ہونے سے آدمی خوبصورت کہلاتا ہے اسی طرح اندرونی ہیئت کی خوبی سے خوش خلقی پیدا ہوتی ہے جس طرح ظاہری جمال کے لئے آنکھ، ناک، کان، وغیرہ کا خوبصورت ہونا ضروری ہے اسی طرح خلق کی خوبی کے واسطے ان چاروں قوتوں کا حسن لازمی ہے، قوت علم، قوت غضب، قوت خواہش اور قوت عدل، قوت علم کا حسن یہ ہے کہ انسان جھوٹ، سچ، حق وباطل اور اچھے برے اعمال کے تمیز کرنے میں پوری طرح قادر ہو۔ قوت غضب کا حسن یہ ہے کہ غصہ کی باگ ڈور عقل کے ہاتھ میں رہے، قوت خواہش کا حسن یہ ہے کہ وہ شریعت اور عقل کی مرضی کے تابع رہے، اور قوت عمل کا حسن یہ ہے کہ انسان اپنی قوت غصہ اور قوت خواہش کو عقل کے اشارے کے تابع رکھنے پر قادر ہو، جس کے اندر یہ چار قوتیں خوبی کے ساتھ پائی جائیں وہ صاحب حسن خلق سمجھا جائے گا۔ (اسلامی اخلاق از جیب الرحمٰن خاں شروانی) اور علامہ اقبال نے کہا کہ "یاد رکھو! انسان کی بقا کا راز انسانیت کے احترام میں ہے جب تک تمام دنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض احترام انسانیت کے درس پر مرتکز نہ کردیں گی دنیا بدستور درندگی کی بستی بنی رہے گی" (آئندہ اقبال)

ایک خاص تعلیمی اور اخلاقی تحریک ہے ابتدائے اسلام میں نہ اسکول تھے نہ کالج نہ یونیورسٹیاں تھیں اور نہ بڑے بڑے تعلیمی ادارے پھر بھی تعلیم وتربیت مکارم اخلاق کا درس اس کی ہر چیز میں نمایاں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عیدین حج وغیرہ عزمنکہ عوام کے لئے تعلیم وتربیت کے بیشمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں اور اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اتباع سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کرلیا کرتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ

(باقی صفحہ پر)

۲۰۷ھ
جمادی الثانی
سنہ ۱۳۸۹ھ
مطابق
۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۶۹ء

پندرہ روزہ
تعمیر حیات
لکھنؤ
شعبۂ تعمیر وترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

چندہ
سالانہ ۸ روپے
ششماہی ۴ روپے
فی کاپی ۲۵ پیسے

جلد نمبر ۶ | بسم اللہ الرحمٰن الرحیم | شمارہ نمبر ۲۱

فہرست مضامین

اداریہ
ملت اسلامیہ تعمیر وتخریب کے دوراہے پر
چاند کی تسخیر اور سائنس کی ترقیات
کتاب وسنت کے علوم اور زمانۂ حال کے اعتراضات
طلبہ کی حالیہ اسٹرائک
فقہی مسائل
یروشلم
کوائف دارالعلوم
اسلام میں اخلاق کی اہمیت
(طلبہ کا صفحہ)

بیت المقدس کی تاریخی اہمیت وتقدس
اور حالیہ المیہ

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے احتجاجی جلسہ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تقریر

آج عالم اسلام کے ہر ہر گوشے میں بیت المقدس کے سانحہ سے متعلق مسلمان اپنے رنج وغم کا اظہار کررہے ہیں، ہماری بہت بڑی سعادت ہے اور ہمارا فرض تھا اور ہے کہ ہم اس احساس میں شریک ہوں اور مسلمانوں کی آواز میں آواز ملادیں، آج ہمارا دل زخمی ہے، ہمارے جگر اور سینے داغ داغ ہیں، ہمارے لئے بڑی بے حرمتی کا مقام ہے کہ ہمارا یہ مقدس مقام ہمارے ہاتھوں سے نکل کر ان ظالم، غاصب اور انسانیت دشمن مجرمین کے ناپاک ہاتھوں کے تصرف میں ہے، جن کو پوری انسانیت سے عداوت ہے۔

بیت المقدس کی دینی اہمیت، اس کا تقدس، اللہ کے یہاں اس کا باعظمت اور قابل احترام وتعظیم ہونا، اسکی پچھلی تاریخ اور انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں اور دعوتوں سے اس کا تعلق اور مسلمانوں کی اس سے اعتقادی، روحانی اور جذباتی وابستگی، یہ سب وہ حقائق ہیں جن کو کچھ زیادہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

آپ سب کو معلوم ہے کہ جب تک بیت اللہ، اللہ کے آخری نبی اور آخری امت کے لئے آخری طور پر قبلہ مقرر نہیں ہوا تھا، عیسیٰ اور عظیم الحکمتوں کی بنا پر جو رسمیں یہاں تھیں، بیت المقدس ہی مسلمانوں کا قبلہ رہا، صحاح کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کے بعد سولہ سترہ مہینے تک اس عصر کے مسلمانوں نے جن کو اللہ کے آخری نبی کی صحبت کا شرف حاصل تھا، اللہ کے حکم سے اور نبی کے عمل کے مطابق اسی قبلہ اول کی طرف رخ کرکے نماز پڑھی اور بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہی مسلمانوں کا قبلہ ہوگا، حالانکہ خانہ کعبہ کی ازلی اور ابدی مرکزیت "اگی قدمت اور مومنین اولین اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے ساتھ جذباتی تعلق کی بنا پر علم الٰہی میں یہ مقدر ہوچکا تھا کہ اصل قبلہ خانہ کعبہ ہی ہوگا۔

اس میں جہاں اور بھی بہت سی حکمتیں تھیں، میرے خیال میں اس میں یہ حکمت بھی پنہاں تھی کہ تقدیر الٰہی میں اس مقام کو مذہبی قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنا ہوا لابنا تھا، آسمانی شریعتوں کے حاملین کا سب سے بڑا معرکہ یہیں پیش آنیوالا تھا۔

مادیت کا مظہر اعظم اور دجل کی ساری طاقتوں کو مجتمع کرنے والے دجال سے اسی سرزمین میں معرکہ پیش

آنے والا تھا، اس لئے مناسب تھا کہ جس امت کو اس دنیا کی امامت وقیادت سپرد ہونے والی تھی، اس کا اس سرزمین سے الیالافانی اور روحانی تعلق پیدا کر دیا جائے کہ اس کو اپنی ذمہ داری ہمیشہ یاد آتی رہے اور اس کی حفاظت کو ہمیشہ اپنا فرض سمجھتی رہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہی اس امانت کی صحیح حفاظت کر سکتے ہیں، دوسری ملتوں کے ساتھ جن کا ان مقامات مقدسہ سے اعتقادی اور مذہبی تعلق ہے ان کے ساتھ صحیح انصاف کر سکتے ہیں اور سب کی رعایت کر سکتے ہیں۔

بیت المقدس کی تعمیر خانہ کعبہ کی تعمیر کے چالیس برس بعد حضرت اسحٰقؑ نے کی تھی، پھر ان کے بعد ان کی اولاد نے اس کی حفاظت کی اور اس کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، یہاں تک کہ جب حضرت سلیمانؑ کا زمانہ آیا تو انھوں نے ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی، اس کے بعد جب اللہ کے آخری نبی کا زمانہ آیا تو مناسب سمجھا گیا کہ سفر معراج میں اس کو ایک منزل قرار دیا جائے تاکہ یہ ثابت ہو جائے کہ پچھلی نبوتوں اور اس نبوت کے درمیان کوئی خلا نہیں، یہ ایک زنجیر مسلسل ہے جس کی تمام کڑیاں ایک دوسرے میں پیوست ہیں، حکمت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ جب اللہ کے آخری نبی اس کی دعوت پر مقام قرب میں تشریف لیجائے تو اس مقام سے گذرتا ہوا جائے جس کا تعلق تمام انبیاء سے رہا ہو اور جو ان تمام امانتوں کی امین ہے، جس کے متعلق قیامت تک کے لئے فیصلہ ہے کہ قوموں کی تاریخ میں اس کو بہت بڑا کردار ادا کرنا ہے، چنانچہ اللہ نے اس مقام کو یہ شرف بخشا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس مقام پر رکے، براق کو باندھا اور تمام انبیاء کی امامت فرمائی، اس کے بعد آسمان پر تشریف لے گئے اور معراج سے مشرف ہوئے۔

پھر جب خلافت راشدہ کا زمانہ آیا تو اللہ نے یہ فیصلہ کیا کہ دنیا اور نسل انسانی کی حفاظت، ان کی صحیح رہنمائی اور ان میں صحیح زندگی پیدا کرنے کا کام ان سے لے تو اللہ تعالیٰ نے ایک علامت کے طور پر بیت المقدس کو مسلمانوں کے حوالے کیا، اس لئے کہ بیت المقدس پر قبضہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ کو اس قوم سے محبت ہے اور اللہ نے اس کو دنیا کی امامت وقیادت کا اہل سمجھا ہے اور اس کی عظمت کا تقاضا تھا کہ عام شہروں کی طرح زور بازو اور قوت شمشیر سے اس کو مسلمانوں کے قلمرو میں شامل نہ کیا جائے ـــــ بلکہ خلیفۃ المسلمین امیر المومنین نائب رسول اور اس وقت دنیا کا سب سے افضل انسان حضرت عمر بن الخطابؓ اس کے لئے سفر کر کے جائیں اور براہ راست اپنے دست مبارک سے اس کی کنجی لیں۔

حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے لئے جو اہتمام فرمایا، وہ اس کی عظمت و تقدس کا تقاضا تھا، میں سمجھتا ہوں کہ تنہا وہاں کے امراء اور پادریوں کے درخواست کی اتنی وقعت نہیں تھی کہ اس کے لئے خلیفۂ ثانی مرکز خلافت کو چھوڑیں اور نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے لئے خطرہ مول لیں، اسکے علاوہ حضرت عمرؓ نے کسی اور شہر پر قبضہ کرنے کے لئے ایک قدم بھی نہیں اٹھایا، (آپ نے شام کا ایک اور سفر بھی کیا لیکن وہ سیاسی اور انتظامی ضرورتوں کے لئے تھا۔)

پھر اس کے بعد مسلمانوں کی حکومت میں انقلابات آتے رہے، بنو امیہ اور بنو عباسیہ کی خلافتیں قائم ہوئیں، اس زمانہ میں اس کا کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ بیت المقدس پر کسی کا قبضہ ہو، لیکن مسلمانوں کے زوال کا ایک دور ایسا بھی آیا جس میں یورپ کی عیسائی طاقتوں نے بیت المقدس پر اپنا قبضہ کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دی، بیت المقدس سے ان کے بھی مذہبی جذبات وابستہ تھے، ان میں جوش پیدا ہوا اور صلیبی جنگوں کے عنوان سے طویل اور خوں ریز معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ایک سیلاب تھا جو عالم اسلام کی طرف امڈا، جس کی زد میں اور مقامات کے ساتھ بیت المقدس بھی آگیا اور انہوں نے اس پر قبضہ کرنے کے بعد مسلمانوں کے خون کے دریا بہا دیئے، ہزاروں ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اور اتنی خوں ریزی کی کہ عیسائیوں کے گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں اس خون میں چلتے تھے اور لوگ پھسل پھسل کر اس میں گرتے تھے۔

عالم اسلام کے لئے یہ اتنا بڑا سانحہ تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی، خاص طور پر اللہ نے جنھیں دینی حمیت کا جوہر عطا فرمایا تھا، مسلمان حکمرانوں میں سب سے زیادہ سلطان نورالدین زنگی ان کے والد محمود زنگی اور سلطان صلاح الدین ایوبی پیش پیش تھے، ان کا یہ احساس اور عقیدہ تھا کہ ایسی زندگی ہمارے لئے حرام ہے جس میں بیت المقدس ہمارے قبضہ میں نہ ہو۔ بیت المقدس کی بازیابی کی مہم شروع ہوئی اور تقریباً نوے برس کے بعد سلطان صلاح الدین ایوبی کو اس میں کامیابی ہوئی، انہوں نے بیت المقدس کو عیسائیوں کے ہاتھ سے نکالا، وہاں جمعہ کی نماز ہوئی اور وہاں سلطان نورالدین زنگی کا تیار کرایا ہوا منبر رکھا گیا، تو عالم اسلام میں مسرت و خوشی کے نادیانے بجے، لوگوں نے ایک دوسرے کو مبارک بادیں دیں اور شعراء نے قصیدے کہے، اور شاید عالم اسلام میں ایسی خوشی کبھی نہیں منائی گئی ہوگی۔

عہد عباسی کے زوال کے بعد جب قسطنطنیہ فتح ہوا اور خلافت اسلامیہ کا مرکز بنا اس وقت سے ترکی سلطان جہاں خادم الحرمین الشریفین ہوا کرتا تھا، وہیں اس کے لئے ایک بہت بڑے شرف کی یہ بات بھی تھی کہ وہ بیت المقدس کا بھی خادم ہوا کرتا تھا، ترکوں نے اس کو ہمیشہ اپنے سینے سے لگائے رکھا اور دل وجان سے اس کی حفاظت کی، یہاں تک کہ جب ترکی سلطنت زوال کا شکار ہوئی اور سلطان عبدالحمید خاں کا زمانہ آیا تو یہودیوں نے سلطان پر ڈورے ڈالنے شروع کئے اور بڑی سے بڑی رشوت جو ہو سکتی تھی، پیش کی، لیکن سلطان کو اللہ نے وہ غیرت ایمانی دی تھی جو صدیوں میں کہیں کسی کو ملا کرتی ہے، انھوں نے بڑی نفرت اور تحقیر کے ساتھ اس سے انکار کر دیا اور ایک تو قع پر فرمایا، خدا کی قسم بیت المقدس کی خاک کی ایک مٹھی ان تمام رشوتوں اور بڑی بڑی تباہ کن پیشکشوں سے مجھے زیادہ عزیز ہے۔ یہودیوں نے پیشکش کی تھی کہ وہ سلطنت عثمانیہ کا سارا قرضہ ادا کر دیں گے، جو کروڑوں سے زیادہ تھا، ساتھ ہی انہوں نے سلطان کو سبز باغ دکھائے اور سیاسی رشوتوں کی پیش کش کی، لیکن انہوں نے بڑی ذلت وحقارت کے ساتھ انہیں نکلوا دیا۔

یہ بات تاریخ کی روشنی میں آگئی ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کی معزولی میں بہت بڑا ہاتھ یہودیوں کا تھا، وہ سلطان کو رام کرنے میں ناکام اور ذلیل ہوئے تھے، انھوں نے قسم کھائی کہ سلطان سے انتقام لینا ہے اور تخت خلافت سے اتارنا ہے، چنانچہ "دونمہ" کے لوگ (ترکی کے بعض حصوں میں رہنے والے نومسلم یہود (اور عیسائی) اپنی سازش میں کامیاب ہوئے، انہوں نے تعلیمافتہ

طبقہ اور انجمن اتحاد وترقی کے ذمہ داروں کو سلطان کے خلاف بھڑکا دیا اور ترکی پارلیمنٹ سے ان کی معزولی منظور کرالی، پارلیمنٹ کا فیصلہ سنانے کے لئے سلطان کے پاس تین آدمیوں کا جو وفد آیا ان میں ایک یہودی بھی تھا، سلطان نے ان لوگوں کو اپنے احسانات یاد دلائے اور ان سب نے سر جھکا دیا، یہودی ذرا پیچھے کھڑا تھا اور سلطان کا رعب ایسا تھا جیسے کوئی شیر پنجرے میں ہو، سلطان نے اس یہودی کی طرف اشارہ کر کے کہا "اس ناپاک اور نجس کا یہاں کیا کام ہے یہ یہاں کیوں آیا؟" یہ کہنا تھا کہ وہ گھبرا کر ایسا بھاگا جیسے کسی کتے پر لکڑی اٹھائیں اور وہ بھاگ جائے۔ بہر حال سلطان خلافت سے معزول کر دیئے گئے۔ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء تک ہونے والی پہلی جنگ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا اس وقت بھی یہودیوں کی ریشہ دوانیاں جاری رہیں، انھوں نے جرمنی کے قیصر ولیم کو تیار کیا اور اس نے خود قسطنطنیہ کا سفر کیا اور ترکی کے ذمہ داروں کو اس پر آمادہ کرنا چاہا کہ ایک چھوٹی سی جگہ میں یہودیوں کو وطن بنانے کی اجازت دیں، لیکن ترکی کے تجدد پسند بھی اس کے لئے تیار نہ ہوئے، ان کو اندازہ تھا کہ عالم اسلام اس کو کبھی برداشت نہیں کر سکتا۔

یہود ادھر سے جب مایوس ہو گئے تو انھوں نے برطانیہ کا رخ کیا اور ان سے وعدہ کرالیا کہ ہم جنگ میں ساتھ دیں گے اور جنگ میں کامیابی کے بعد فلسطین میں ہمیں وطن بنانے کی اجازت دی جائے چنانچہ اس مجرم فطرت قوم نے اس کا وعدہ کر لیا جس کی پوری تاریخ داغدار ہے، جس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی جرائم پیشہ، ظالم، ذلیل، احسان فراموش اور غدار قوم نہیں گذری نہ گذرنے کی امید ہے، جس کو انگریز برطانوی قوم کہتے ہیں، اس کا ایک ایک فرد اس قابل ہے کہ ساری انسانیت مدعی بنے اور یہ مدعی علیہ بنیں اور ایک ایک انگریز کو پھانسی کے تختے پر چڑھا کر اور ان کی پوری تاریخ سنا سنا کر ان کی پچھلی نسلوں کا بھی بدلہ لیا جائے، اس بدبخت اور خبیث قوم نے وطن الیہود کے منصوبے کو قبول کیا اور "اعلان بالفور" کے نام سے اس کی اجازت دی کہ وہ دنیا کے تمام خطوں سے آکر فلسطین میں آباد ہوں اور اس کو اپنا قومی وطن بنائیں۔

ادھر عربوں کی بدقسمتی کہ یہی زمانہ مسلمانوں اور عربوں کے زوال کا تھا اور بجائے اس کے کہ وہ ترکوں کا ساتھ دیتے جو اخلاقاً عرفاً اور سب سے بڑھ کر شرعاً ان کا فرض تھا۔ ترکوں میں خواہ کتنی بھی خرابیاں تھیں ـــ بہر حال وہ کلمہ گو مسلمان تھے، انہوں نے چار سو برس تک اسلام کا جھنڈا یورپ کے قلب میں گاڑے رکھا اور مسلمانوں کی عزت وآبرو ان کے دم سے قائم تھی، انھوں نے عربوں کو اپنے سر پر بٹھا کر رکھا اور آنکھوں میں جگہ دی، اپنی عقیدت کے غلو میں ان کو پیرزادہ اور پیغمبرزادہ بنا کر رکھا لیکن جب وقت آیا تو انگریز عربوں کو ملانے میں کامیاب ہو گئے انھوں نے ترکوں کے ساتھ غداری کی، یہ وہ وقت تھا جب تقدیر الٰہی نے فیصلہ کیا کہ اب مسلمانوں کو عرصہ تک ذلت پر ذلت اٹھانی پڑے گی اور مسلمان اس زمانہ میں عزت نہیں پا سکتے، یہ اتنا بڑا گناہ اکبر اور مہاپاپ تھا کہ اللہ نے اس کو اب تک معاف نہیں کیا، اس کی سزا انہیں ابھی تک مل رہی ہے۔

عربوں کو اس غداری کا یہ انعام ملا کہ فلسطین پر برطانیہ کا استداب اور سیریا ولبنان پر فرانس کا انتداب قائم ہو گیا اور جب وہ وہاں سے اٹھے تو فلسطین کو برائے نام مسلمانوں اور اصلاً یہودیوں کے حوالے کر گئے، جس کے نتیجے میں خوں ریز خانہ جنگی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن رفتہ رفتہ مسلمانوں کا جذبہ سرد ہوتا گیا، یہ ایک لمبی جنگ تھی جس کے لئے بہت صبر وتحمل کی ضرورت تھی اور افسوس کہ مسلمانوں میں ہمیشہ اس کی کمی رہی، مسلمان سو گئے اور یہود بیدار رہے، ان کے مہاجرین کا سیلاب وہاں آتا رہا اور ان کا ایک طاقتور مرکز قائم ہو گیا۔

۱۹۴۸ء میں عرب کچھ جاگے، ان کی سات حکومتوں نے لشکر یہودیوں پر چڑھا کیا، لیکن عربوں میں صحیح معنوں میں اتحاد اور خلوص نہیں تھا، اس نازک موقع پر ایمان، عرفان، خلوص اور جذبۂ قربانی کی گرانمایہ طاقت لیکر اخوان مجاہدین میدان میں آئے، حسن البنا شہید نے اعلان کیا کہ ہم پچاس ہزار سپاہی میدان جنگ میں لا سکتے ہیں اور انہوں نے رضاکاروں کی تنظیم کی۔

اس وقت برطانیہ وامریکہ کے کان کھڑے ہوئے کہ جو جماعت ۵۰ ہزار جانباز مجاہد دے سکتی ہے وہ کیا نہیں کر سکتی، اسی وقت مصر کی تیادت کو ان کی طاقت کا احساس ہوا، اس وقت سے اب تک مخلص مجاہدین کی یہ تنظیم یہودیوں اور استعماری طاقتوں کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار ہے۔

اخوان نے واقعۃً اپنے سپاہی میدان میں بھیجے اور اس کو سبھوں نے تسلیم کیا ہے کہ صحیح طور پر اور بے جگری سے جنگ کرنے والے صرف اخوانی سپاہی تھے، یہاں تک وہ وقت آیا جب تل ابیب تھوڑی دور رہ گیا اور سامنے نظر آنے لگا عین اس وقت پیچھے سے ڈوری کھینچ لی گئی، ملک عبداللہ جو اس وقت عرب فوجوں کے سپریم کمانڈر تھے انہوں نے جنگ بندی کا اعلان کر دیا اور مجاہدین تڑپ کر رہ گئے۔

مجھے خود ان لوگوں نے سنایا ہے جو اس معرکہ میں شریک تھے اور ابھی زندہ ہیں کہ انھوں نے خوشامد کی کہ چند گھنٹوں کی مہلت دے دی جائے تو ہم ہمیشہ کے لئے یہ قصہ ہی پاک کر دیتے ہیں لیکن جنگ بند ہو گئی، اسی وقت سے فلسطین کا قضیہ جو الجھا ہے تو آج تک نہیں سلجھ سکا۔

بڑی طاقتوں کو بھی یہی منظور تھا کہ عربوں کے سینے میں ایک پھانس چبھو دیں اور ان کو مجبور کر دیں کہ ان کے چشم وابرو کے اشارے کے بغیر دم نہ مار سکیں، یہ بڑی طاقتوں کی انتہائی خباثت، انتہائی دروغ گوئی، انتہائی سفاکی، اور انتہائی بے رحمی تھی بلکہ اس جرم کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے الفاظ ناکافی ہیں۔

پھر وہ جون کا معرکہ پیش آیا، جس میں عربوں کی قیادت اتنی کمزور ملک فروش ضمیر فروش اور دینی جذبات سے عاری تھی کہ وہ کسی طرح یہودیوں کے نوخیز اور ولولے سے بھرپور طاقت کی حریف نہیں ہو سکتی تھی، وہاں وہ طاقت تھی جس کا یقین تھا کہ ہم کو ارض موعود مل کر رہے گا جو ہر قدم پر توریت کے احکام دیکھتی تھی، دوسری طرف لوگ ہر ہر قدم پر اپنے آقاؤں کو دیکھتے تھے، یہود نے یہ طے کر لیا تھا کہ ایک مرتبہ تو زور کا حملہ کرنا ہے نتیجہ کچھ بھی ہو بعد میں دیکھا جائے گا، حقیقت پسند طاقتوں کی ہمیشہ یہ سیاست اور ان کا طرز عمل رہا ہے، اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

بقیہ صفحہ پر

ملت اسلامیہ تعمیر و تخریب کے دوراہے پر

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی

انگلستان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے شیفیلڈ میں پورے انگلستان سے تبلیغی کارکنوں کا ایک اجتماع ہوا ۲۸۔ جون ۱۹۶۹ء کو بعد عصر حضرت نے جو تقریر فرمائی تھی اس کو ہم ہدیۂ "فاران" (لندن) ان صفحات میں پیش کر رہے ہیں — (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد!

میرے بھائیو اور دوستو! میں نے آپ کے سامنے ابھی سورۂ بقرہ کی ایک آیت پڑھی ہے اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو اور نیکی کرو بیشک اللہ تعالیٰ اچھی طرح کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے یہ آیت ہے جس کا ایک ٹکڑا بہت سے مسلمانوں کو یاد ہوگا۔ اور بہت جگہ اس سے صحیح اور غلط طریقے پر کام بھی لیا گیا "ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ" اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ پڑو۔ اس آیت کی صحیح تفسیر اور اس کے نازل ہونے کا موقع اور اس کی اصل مراد اس واقعہ سے ہوگی جو میں آپ کو سنانے والا ہوں۔

ایک مرتبہ مسلمانوں کی ایک فوج جس میں صحابۂ کرام بھی اور بڑے مرتبہ کے مسلمان تھے۔ قسطنطنیہ (استنبول) کا محاصرہ کر رہی تھی۔ وہ قسطنطنیہ جو اس وقت بھی خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔ لیکن اس وقت اس کا فتح ہونا مقدر نہ تھا، اللہ تعالیٰ کو کسی زمانہ میں کسی اور سے یہ کام لینا تھا۔ اور اسے اسلام کے قبضے میں آنا تھا۔ اس وقت اس فوج میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ تھے، انہیں میں سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے جن کو صحابیت کے شرف اور دوسرے بڑے بڑے کمالات کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی دولت سے بھی نوازا تھا جس پر قیامت تک مسلمانوں کو رشک آئے گا اور رشک آنا چاہیئے یعنی کہ جو ساری دنیا کا میزبان تھا جس کو اللہ تعالیٰ نے ساری دنیا کی ضیافت کرنے اور اللہ کے مہمان نعمت سے فائدہ اٹھانے کے لئے مبعوث فرمایا تھا، ان کے میزبان ہونے کا شرف اللہ تعالیٰ نے سیدنا ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو عطا فرمایا یعنی میزبان عالم ان کا مہمان رہا ہے یہ ایسی فضیلت تھی کہ تمام صحابہ کرام اس کا پاس و لحاظ رکھتے تھے اور ان کو رشک و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کی ہر بات بڑی توجہ سے سنی جاتی تھی۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان ہونے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے آپ کی ضیافت کی اور آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کیا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ ان کو سب سے پہلے زیادہ قرب کا موقعہ ملا۔ اس لئے اسلام کی روح سمجھنے اور اللہ تعالیٰ کے کلام کا منشاء سمجھنے کا ان کو وہ حق بھی تھا جو ہر مسلمان کو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولیں صحبت بھی حاصل ہوئی تھی۔ اس لئے ذات نبویؐ سے مناسبت و قربت نے ان کو موضوعہ فراست اور ایمانی ذہانت کو جلا بخشی تھی اور انہوں نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے۔ وہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی اس جہاد میں بنفس نفیس شریک تھے۔

اسی دوران میں کہ محاصرہ جاری تھا اور بڑے گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی، یہ دیکھا کہ ایک صحابی سرکیف اپنی صف سے نکلے اور صفوں کو چیرتے پھاڑتے آخری صف تک کہ جہاں عام طور پر فوج کو لڑانے والے ہوا کرتے ہیں، وہاں تک پہونچ جاتے۔ پھر اسی طریقہ سے صفوں کو درہم برہم کرتے ہوئے واپس ہوتے جیسے کوئی مشاق کھلاڑی اپنے کمالات دکھاتا ہے، اس طرح وہ دور تک دشمنوں کی فوج میں پہونچ جاتے اور پھر چلے آتے، دیر تک یہ منظر مسلمانوں کے سامنے رہا تو ایک مسلمان کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ یہ کام تو صریحاً قرآن مجید کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ۔ تم اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی جان بوجھ کر ایسا کام نہ کرو جس سے جان جاتی ہو اور یہ تو ایک طرح کی خودکشی ہوئی۔ یہ شخص اس طرح کی خودکشی کر رہا ہے کہ ایک اکیلا آدمی اس طرح دشمنوں کے نرغے میں گھس جاتا ہے۔ گویا دشمنوں کے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے، اللہ اس کو بچا لیتا ہے اگر وہ بجائے اس کے کہ اس کی نعمت کا شکر ادا کرے، پھر دوبارہ اس خون کے سمندر میں چھلانگ لگاتا ہے، یہ اس کو مناسب نہیں، یہ کام جائز نہیں۔

سیدنا ابوایوب انصاریؓ نے اس پر فرمایا کہ دوستو! اس آیت کی تفسیر ہم سے پوچھو۔ یہ تو ہمارے گھر کی آیت ہے۔ یہ ان آیتوں میں سے ہے جن کا تعلق خاص طور پر حضرات انصار رضی اللہ عنہم سے ہے صحابہ کرامؓ متوجہ ہوئے اور تمام مسلمان تن گوش بنکر کھڑے ہو گئے کہ دیکھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ میزبان اور جلیل القدر صحابیؓ قرآن کا بہت بلند علم رکھنے والے اس آیت کی کیا تفسیر بیان کرتے ہیں۔

انہوں نے فرمایا کہ اصل میں یہ آیت اس موقع پر نازل ہوئی تھی کہ جب اسلام مدینہ پہونچا اور گھر گھر پھیلنا شروع ہوا تو ابتداء میں ہم لوگ اپنا سب کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے آنکھیں بند کر کے دین کے کام میں ہمہ تن لگ گئے۔ کیسا باغ؟ کہاں کی کھیتی؟ کیسی دکان؟ کیسا مکان؟ کیسی اولاد؟ سب کچھ دین پر قربان تھا اور ساری پونجی اس پر نثار تھی، بالکل ایک سرفروشی اور جذبہ فراموشی کی حالت تھی جو اسلام کی خدمت کے لئے سب پر چھائی ہوئی تھی، کسی کو اپنے گھر بار کا ہوش نہ تھا۔ اس ایثار و قربانی کا اس ظاہری دنیا میں جو فطرتی نتیجہ ہوا کرتا ہے اور جو قانون خداوندی تکوینی ہے وہ ہوا، ہماری تجارت کے دیوالیے نکل گئے، ہمارے باغات ویران ہو گئے، ہماری کھیتیاں برباد ہو گئیں، ہماری آمدنیاں ختم ہو گئیں، غرض یہ کہ ہمارے کاروبار اس سے متاثر ہونے لگے لیکن اسلام گھر گھر پھیلنے لگا۔ اور جیسے زور پھیلتا ہے اور بارش ہوتی ہے اس طرح اسلام مدینہ میں پھیلنے لگا۔ اب پہلی حالت نہ رہی یعنی اتنا تو ابھی نہیں ہوا کہ سارا مدینہ مسلمان ہو جائے لیکن ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔ بہتیرے گھرانوں میں ایمان سے مالا مال اور سینکڑوں اس باران رحمت سے نہال ہو گئے۔

اس وقت ہمارے دل میں آیا کہ پہلے کی طرح اب اس درجہ ہماری خدمات کی، ہمارے کل اوقات کی، اور ہمارے بالکل تن من دھن سے اس خدمت میں لگ جانے کی ضرورت نہیں ہے، احکام حالات کے ساتھ بدلتے ہیں۔ اس وقت یہ حکم تھا کہ کوئی اپنے گھر نہ بیٹھے، کوئی اپنی جان کو، اپنے مال کو اور اپنی اولاد کو اسلام سے زیادہ عزیز نہ سمجھے اور جب ضرورت تھی ہم سب کچھ بھول کر اسلام کی خدمت کے لئے کود پڑے تھے۔ اللہ نے ہم کو توفیق دی اور ہم نے ایسا کیا۔ لیکن اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے۔ اب خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں کی تعداد میں بہت بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔ اب اسلام کے خدمت گذار اور اس کے سپاہی اور اس کے مبلغ بہت ہیں اس لئے اگر ہم تھوڑے دن کی چھٹی لے لیں تو کیا حرج ہے؟ چھٹی کا قانون تو ہر نظام میں ہوتا ہے۔

یہ بات تو ان حضرات کے ذہن میں وسوسے کے درجے میں بھی نہیں آسکتی کہ ہم اپنے آپ کو مستقل طور پر سبکدوش کرالیں کہ حضور اب اسلام کی خدمت کرنے والے بہت ہو گئے ہیں۔ ہم کو آپ چھٹی دے دیجئے تاکہ ہم اپنے گھر جا کر بیٹھیں اتنے دن ہم نے کام کیا، اب دوسرے کام کریں۔ یہ بات تو ان حضرات کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی، صرف اتنا ہی خیال ہوا تھا کہ وقتی طور پر کچھ چھٹی لے لیں، آدمی محاذ جنگ سے بھی چھٹی لیا کرتا ہے، اس کو گھر واپس کیا جاتا ہے، اسی طریقے سے ہسپتالوں سے بھی چھٹی دی جاتی ہے اور ایسے بہت سے نازک محاذ اور نازک کام ہیں کہ جہاں کوئی وقت آتا ہے کہ آدمی چھٹی لیتا ہے تاکہ ذرا تازہ دم ہو جائے آرام کرلے، اپنے گھر کے ضروری کام انجام دے آئے۔

حضرت ابوایوب انصاریؓ فرماتے ہیں کہ ہمارے دل میں صرف یہ خیال آیا تھا کہ ہم تھوڑے دن کے لئے چھٹی لے لیں — اس خیال کا آنا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ یہ کیا خطرناک زہریلا خیال تمہارے دل میں آیا۔ یہ کیا شیطانی وسوسہ تمہارے دل میں آیا۔ تم اللہ کے کام سے چھٹی لینا چاہتے ہو۔ جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کا نتیجہ تم جو سمجھ رہے ہو۔ وہ نہیں ہے، بلکہ تم جو سمجھ رہے ہو۔ وہ ہو جائے گا۔ یعنی کھیتیاں سرسبز ہو جائیں گی اور یہ چھوٹی چھوٹی پونجی کی دکانیں جس میں کسی میں سو کسی میں پانچ سو کا سامان ہے اور برائے نام معمولی سا کاروبار اس میں تمہیں کامیابی ہو جائے گی، تمہاری دوکانیں جو بالکل مٹ گئی ہیں جس میں خاک اڑنے لگی ہے وہاں دو چار گاہک نظر آنے لگیں گے، اس میں روزانہ دس بیس درہم کی آمدنی شروع ہو جائے گی، تمہارے جو باغ بالکل سوکھنے لگے ہیں ان کو پانی دو تو وہ ہرے بھرے ہو جائیں گے لیکن اس کے دو نتیجے نکلیں گے ایک کا تعلق تمہاری ذات سے اور دوسرے کا تعلق پوری کائنات سے ہے جہاں تک انسانی ذات کے تعلق کا سوال ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارا نام خدا کے یہاں خدمت گذاروں اور اسلام کے سپاہیوں کی فہرست سے کٹ جائے گا اور تم بھی انہیں قوموں میں شمار کئے جانے لگو گے جن کی قسمت پر مہر لگا دی گئی ہے اور جن کو جانوروں کی فہرست میں لکھ دیا گیا ہے اور جن کے متعلق فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ان کا کام گائے بیل گھوڑے کی طرح کھانا کمانا اور پیٹ بھرنا ہے اور اس کے بعد حشرات الارض کی طرح زندگی گزار کر دنیا سے چلے جانا۔ آج تمہارا نام رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے سپاہیوں، ساتھیوں، جاں نثاروں اور انسانیت کو سرسبز کرنے والوں میں لکھا ہوا ہے۔ دنیا کے معماروں میں نیز دنیا میں دوبارہ بہار لانے والے اور ان بہار لانے کے لئے کوشش کرنے والوں میں لکھا ہوا ہے۔ تمہارے لئے دنیا کی حیات نو اور دنیا کی حیات بخشی مقدر ہے کہ تمہارے ہاتھوں پر یہ دنیا جو کہ محض ایک قبرستان بنکر رہ گئی ہے جہاں ناؤنوش اور عشرت پینے پلانے اور کھانے کمانے کے سوا کوئی آواز بھی نہیں آتی، اس دنیا کو دوبارہ زندہ کرنا مقدر ہے، اس فہرست سے تمہارا نام نکل جائے گا اور یہ دنیا جو اللہ سے بچھڑ گئی تھی خدا کو بھول گئی تھی، آج پھر تمہارے ذریعے سے خدا کی چوکھٹ پر سر جھکانے لگی ہے اور جن کے نام باغیوں میں لکھے ہوئے تھے، ان کا شمار اولیاء اللہ میں — عارفوں میں، عبادت گزاروں اور علماء ربانیین میں، دنیا کے نجات دہندہ لوگوں کی فہرست میں لکھے جانے والے ہیں۔ یہ فیصلہ بدل جائے گا۔ اگر تم کاروبار میں لگنا چاہتے ہو تو پہلا نقصان تو اٹھا کرو گے کہ اس قدسی اور نورانی فہرست سے کٹ کر محض اپنے لئے جینے اور مرنے والوں میں تمہارا نام لکھ دیا جائے گا۔

دوسرا نتیجہ جو اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، وہ یہ ہے کہ دنیا کے لئے اللہ تعالیٰ نے جو فلاح کا دروازہ کھولا ہے کہ یہ دوبارہ ہدایت کا دروازہ کھولا ہے اور اس دنیا کے متعلق اب اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا یہ جو فیصلہ ہے کہ یہ دنیا دوبارہ خدا کو پہچانے، دوبارہ خدا کے راستے پر چلے، دوبارہ خدائے واحد کی بندگی کرے اور پھر اس دنیا میں بہار آئے اور انسان کو اپنا حقیقی مقام معلوم ہو۔ اور انسان کو اپنی زندگی کا مقصد معلوم ہو۔ یہ دروازہ بند ہو جائے گا۔

ہم چوپائے درندے نہیں اور ہم فرشتے بھی نہیں ہیں بلکہ ہم انسان ہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ضروریات زندگی کو بقدر ضرورت مہیا کر کے ہم اللہ کے کام میں لگیں، اللہ کے دین کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلائیں، اللہ کے پیغام کو دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو نقصان یہ ہوگا کہ پورا یہ عالم انسانی اور یہ پوری کائنات اس نعیم سے محروم رہے گی اور اللہ تعالیٰ ان کو جو نعمت عطا فرمانا چاہتا ہے، اس نعمت کو روک لے گا، لہٰذا اس نعیم سے محرومی ہلاکت ہے تمہارے حق میں بھی اور دوسروں کے حق میں بھی، تم دین کا کام چھوڑ کر اس شاخ پر تیشہ چلاؤ گے جس پر تمہارا آشیانہ ہے تم تو دنیا میں کمی شمار و قطار میں نہ تھے اور معلوم نہیں تم کتنی بیماریوں کے شکار ہو سکتے تھے۔ کتنے دشمنوں کا نقطۂ اجل بن سکتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تم کو ہر موقع پر بچایا۔ اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے لئے منتخب فرمایا اور تمہیں ایسی نعمتیں عطا فرمائیں جو دوسروں کو نہیں ملیں۔ اور تم میں ایک نیا حوصلہ عطا فرمایا، تمہارے دست و بازو کو نئی طاقت عطا فرمائی، تمہاری ہمتوں کو بلند کیا اور نگاہوں کو روشن کیا۔ یہ سب اس اسلام کے طفیل تھا۔

اب اگر تم اسلام کی خدمت سے ہاتھ اٹھاتے ہو۔ تو اپنا بھی نقصان کرو گے اپنے حق میں خودکشی اور دنیا کے حق میں بہت بڑی ہلاکت اور خسارہ کا سامان کرو گے دنیا ایک رخ پر جاتے جاتے نوگادر دوسرے رخ پر پڑ جائے گی ابھی اس کا رخ ضلالت کی طرف، شقاوت سے سعادت کی طرف ظلمت سے نور کی طرف جہالت سے علم کی طرف پڑا ہے، پڑا بھی کہاں ہے؟ پڑنے کی امید پیدا ہوئی ہے لیکن اگر تم اسلام کی خدمت سے ہاتھ اٹھا کر اپنے اپنے پیٹ کی سوچو میں، اپنے اپنے بچوں کی پرورش میں، اپنے اپنے گھر والوں کی خدمت میں لگ جاؤ گے اور گویا تم اللہ کی عبادت سے ہٹ کر اپنے نفس کی عبادت میں لگ جاؤ گے تو پھر دنیا پر خیر کا یہ دروازہ بند کر دیا

جائے گا یہ ہے تفصیل ان حالات کی جن میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تھی اس آیت کے معنی وسیع اور اس کے نتائج دور رس ہیں یہ آیت کسی ایک انسان کے ایک انفرادی خودکشی کے بارے میں نہیں اتری ہے کسی ایک فرد کے ہلاکت میں پڑنے کے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ ایک بہت بڑے اہم موقع پر نازل ہوئی تھی جس کا تعلق پوری نوع انسانی اور اس کے مستقبل سے ہے یعنی وہ لوگ جو دنیا میں ہدایت کا کام کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے دنیا کو نئے حقائق کی طرف توجہ ہو سکتی ہے، نئی منزل کی طرف توجہ ہو سکتی ہے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہو سکتی ہے جن کے ذریعہ انسان اپنی موجودہ زندگی پر پشیمان ہو کر سوچتا ہے۔ کہ پائے میں کیا زندگی گذار رہا ہوں یہ تو جانوروں کی، چڑیوں کی اور چوپایوں کی زندگی ہے کھانا پینا اور بستر پر دراز ہو کر سو رہنا اور پھر اٹھ کر بیل، گھوڑے کی طرح اس کام میں جت جانا یہ کوئی انسانی زندگی ہے؟ جو جماعت انسانوں کو چونکائے اس کی دعوت سے اس کے عمل اور کردار کی تاثیر سے اور اس کی تبلیغی سرگرمی کی وجہ سے لوگوں کے دماغوں پر چوٹ پڑے لوگوں کے دماغوں پر یہ ضرب لگے کہ نہیں نہیں یہ زندگی نہیں ہے۔ وہی اگر اس عمل سے فرار اختیار کرے تو دنیا کو کون سنبھالا دے سکتا ہے۔ کوئی ہوگا جو دنیا والوں کو بلند حقیقت کی طرف متوجہ کرے گا اور ان سے کہے گا کہ اے انسانو! یہ کیا زندگی ہے عمدہ سے عمدہ پہننا اور آراستہ ہو کر نکلنا زندگی ہے تو یہ تو موروں کی زندگی ہے اگر خوش آوازی اور خوش آہنگی زندگی کا حامل ہے تو بلبل میں تم سے زیادہ زندگی ہے۔ اگر دوسروں کا پیٹ کاٹ کر کے، دوسروں کا خون پی کر زندگی گذارنا آدمیت اور مقصد زندگی ہے تو یہ تو موروں کی زندگی اور تیندوے اور بھیڑیے تم سے زیادہ زندگی اور آدمیت کے راز سے واقف ہیں۔

میرے دوستو! اگر ایک شخص ہتھیلی پر سر رکھ کر میدان جنگ میں کودتا ہے تو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ زندہ سلامت بچ کر آجاتا ہے، حضرت خالدؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑھ کر کس نے اپنے آپ کو جان جوکھوں میں ڈالا ہوگا خالدؓ سیف اللہ سے بڑھ کر کون موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر لڑا ہوگا، اور ہمیشہ موت کو ہنسی کھیل سمجھا ہوگا۔ بتائیے اسلام کی تاریخ میں جانبازی کی تاریخ میں سرفروشی کی تاریخ میں خالدؓ سے بڑھ کر جانباز اور سرفروش اور حضرت خالدؓ سے بڑھ کر خود فراموش کوئی گذرا ہے؟ لیکن وہی خالدؓ جب انتقال ہونے لگا اور بستر پر طبعی موت آنے لگی تو کہنے لگے میری زندگی میں کوئی ایسا موقع نہیں آیا کہ جہاں موت کا امکان ہو اور میں نے وہاں اپنے آپ کو پیش نہ کیا ہو لیکن خدا کی شان کہ آج میں بستر پر مر رہا ہوں فلانا مت أعين الجبناء فلانا مت أعين الجبناء فلانا مت أعين الجبناء خدا کرے بزدلوں کی آنکھ کو چھوئے نہیں، بزدلوں کو نیند نصیب نہ ہو اس لئے کہ مجھ سے بڑھ کر اپنی جان ہلاکت میں ڈالنے والا اور شہادت کی تلاش میں نکلنے والا اور کون ہوگا؟ لیکن آج خدا دکھا رہا ہے کہ میں بیماری کے بستر پر مر رہا ہوں اور جو لوگ موت سے بھاگتے تھے کتنے دنیا سے رخصت ہو گئے اور وہ اپنے تمام اندازوں کے خلاف اور تمام تیاریوں کے خلاف موت کا نشانہ بن گئے دوستو! خودکشی یہ نہیں ہے کی آدمی کسی وقت اپنی جان پر کھیل کر کسی وقت اپنے کاروبار کو خطرے میں ڈال دے کسی وقت دور اندیشوں اور ہوشیار لوگوں کے مشورہ کی خلاف ورزی کرے جب لوگ اس کو اس طرح کے مشورہ دیں۔ کہ بھائی! یہ وقت کاروبار ملتوی کرنے کا نہیں ہے یہ وقت دوکان چھوڑ کر جانے کا نہیں ہے، یہ وقت گھر بار چھوڑ کر جانے کا نہیں ہے، اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے، تو وہ ان لوگوں کے مشورے کے خلاف چل پڑے جو لوگ کسی کسی وقت آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں یا دیکھی ان دیکھی کر دیتے ہیں وہ خودکشی نہیں کرتے ہیں خودکشی وہ کرتا ہے جو اپنا مقصد زندگی فراموش کر کے اپنے نفس کی پرستش میں لگ جاتا ہے ایک مسلمان فرد اور ایک مسلمان جماعت کے لئے خودکشی یہ ہے کہ اپنا حقیقی مقصد بھول کر اور جو کام اللہ نے اس کے سپرد کیا ہے اس کو فراموش کر دے اور یہ بھول جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس دنیا میں ایک اہم فرض کی ادائیگی کے لئے مبعوث کیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تؤمنون باللہ ——— یعنی تم اس کام کے لئے محض اسی مقصد کے لئے دنیا میں بھیجے گئے ہو لہٰذا اگر تم اس کام کو بالائے طاق رکھ دو اور کاروبار میں سر سے پاؤں تک ڈوب جاؤ اور خالص کاروباری انسان بن جاؤ، بزنس مین بن جاؤ اور تمہاری سب سے بڑی تعریف یہ ہو کہ تمہارے بارے میں یہ کہا جائے کہ فلاں تو بڑا کاروباری ہے، کوئی مسلمان فرد کوئی مسلمان گروہ اگر خالص کاروباری حیثیت اختیار کرے یعنی اپنے لئے یہ پوزیشن قبول کرے کہ میں کاروباری ہوں، میرا کاروبار مقدم ہے، پیٹ مقدم ہے دنیا کے تقاضے مقدم ہیں گھر والوں کے مطالبے مقدم ہیں گھر والوں کی ضرورتیں مقدم ہیں اسی کو قرآن مجید خودکشی کہتا ہے قرآن اس کو خودکشی نہیں کہتا جس میں موت موہوم ہو اس کو خودکشی کہتا ہے جس میں حقیقی موت ہو یقینی خودکشی وہ نہیں جس میں موت کا امکان ہے خودکشی وہ ہے جس میں موت یقینی ہے خودکشی وہ نہیں ہے جس میں یہ عارضی جسم ہلاک ہو جائے بیمار ہو جائے تکلیف اٹھائے جس کو ایک دن مرنا ہے جس کی حیات عارضی ہے خودکشی وہ ہے جس میں وہ روح تلف ہو جائے جس کو موت نہیں خودکشی وہ ہے جس میں وہ مقصد فوت ہو جائے جو سرمایہ تھا، جو اثاثہ تھا، جو پونجی لے کر نکلے تھے وہ ڈوب جائے یہ ہے کاروباری ذہنیت کے خلاف اور پونجی سلامت رہے اور آج کا نفع نہ ملے یہ کاروباری ذہنیت کے خلاف نہیں حقیقی کاروبار وہ ہے جو اپنی پونجی سلامت رکھ کر نئے نئے تجربہ کرے خودکشی یہ ہے کہ آدمی دعوت کا کام نہ کرے، آدمی اسلامی زندگی اختیار کرنے کے لئے نہ نکلے اور دین کے لئے ہجرت نہ کرے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت فرمائی اس کے بعد بہت سے لوگ بلکہ بہت سے صحابی بیٹھے رہ گئے، کمزور تھے اور بہت سے کمزور نہیں تھے مگر انھوں کے وقت کی نزاکت کو محسوس نہیں کیا اور ہجرت نہیں کی اور بہت سے وہ تھے جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یا بعد میں مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تھی انھوں نے کیا فتوحات حاصل کیں اور مراتب حاصل کئے وہ ان سے کہیں زیادہ تھیں جنہوں نے ہجرت نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ والسابقون الاولون من المھاجرین والانصار والذین اتبعوھم باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح اولائک اعظم درجۃ من الذین انفقوا من بعد وقاتلوا ——— وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا اور اللہ کی راہ میں جان کی بازیاں لگائیں وہ اور جنہوں نے بعد میں جان کی بازیاں لگائیں برابر نہیں ہو سکتے غرض یہ کہ حقیقی خودکشی یہ ہے کہ انسان اپنے حقیقی فائدہ سے اپنی آنکھیں بند کرے اور اپنے حقیقی فائدے کو خطرے میں ڈالے، موہوم فائدے کو خطرے میں ڈالنا خودکشی نہیں ہے یقینی فائدے

ہو جو کو یقینی طور پر خطرے میں ڈال دینا اور ہمیشہ کے لئے تلف کر دینا اور ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو جانا یقیناً خودکشی ہے اور اپنے کو واقعی نقصان پہونچانا ہے (باقی)

چاند کی تسخیر اور سائنس کی ترقیات

ایک مسلمان کی نظر میں

از۔ مولانا تقی الدین صاحب ندوی مظاہری شیخ الحدیث
دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر، سورت، گجرات۔

قرآن مجید کا مقصد اصلی

آج کل یہ مسئلہ بہت اہمیت کا طالب بن گیا ہے کہ انسان نے سائنس و ایجادات کے میدان میں حیرت انگیز ترقیاں کیں، اور کرتا چلا جا رہا ہے، حتیٰ کی اب اس کی رسائی چاند تک بھی ہو گئی، ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اس کو کس نوعیت سے دیکھیں؟

جو لوگ قرآن و حدیث کے مقاصد سے ناواقف ہیں یا ضعیف العقیدہ ہیں، وہ ممکن ہے کہ شکوہ و اوہام میں گرفتار ہو جائیں، حالانکہ قرآن مجید کے نازل ہونے کا مقصد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آمد کی غرض صرف یہ ہے کہ بندوں کا اپنے مالک و پیدا کرنے والے سے صحیح رشتہ قائم ہو جائے قرآن مجید نے اپنے نزول کا مقصد بار بار یاد دلایا ہے، اس سلسلے کی چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

ذلک الکتاب لاریب فیہ ھدی للمتقین (بقرہ) "یہ کتاب اس میں کوئی شک نہیں یہ پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے" (بقرہ)

وننزل من القرآن ما ھو شفاء ورحمۃ للمومنین ہ لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی نصیحت آچکی۔ قل ھو للذین آمنوا ھدی وشفاء۔ اور وہ دلوں کے امراض کے لئے علاج ہے اور مسلمانوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔ ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم۔ (اسراء) بے شک یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے صحیح اور سیدھی ہے (اسراء)

غرض یہ کہ قرآن مجید کے احکامات و ہدایات اور ارشادات ہی وہ خصوصی اوصاف ہیں، جو اس کی دعوت کا اصل موضوع ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور دیگر اکابر امت کے نزدیک یہ بھی قرآن مجید کا اعجاز ہے، پس قرآن مجید پر اسی حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہیئے۔ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"محقق آنست کہ مقصد اصلی از نزول قرآن تہذیب بشر است و درہم شکستن عقائد باطلہ و اعمال ایشاں [1]"

یعنی قرآن مجید کے نازل ہونے کا اصلی مقصد انسانوں کی تہذیب و تربیت اور ان کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔

اس کے بعد جو لوگ قرآن میں فلسفۂ قدیم یا جدید یا سائنس کی تحقیقات کو تلاش کرتے ہیں، درحقیقت وہ بہت ہی ناانصافی سے کام لیتے ہیں، اس میں سائنس کے کرشموں، جغرافیہ و تاریخ کے نکات کو تلاش کرنا، اور اسی نقطۂ نظر سے قرآن کی عظمت و صداقت کو جانچنا درحقیقت یہ ان لوگوں کا شیوہ ہے کہ جو قرآن کی حقیقت سے ناآشنا ہیں، ضمنی طور پر اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قرآن مجید میں اس کی طرف بھی اشارات مل سکتے ہیں بلاشبہ قرآن مجید میں کائنات اور اس کے حوادث سے بھی تعرض کیا گیا ہے، مگر ان سب باتوں کی نوعیت کیا ہے، اس کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد پڑھئے۔

"قرآن مجید میں علوم طبیعیہ کا بھی ذکر آتا ہے لیکن فلسفی، اور صاحب قرآن کے نقطۂ نظر میں فرق ہے، مثلاً ایک طبیب جانوروں کو دیکھتا ہے تو وہ اس حقیقت سے غور کرتا ہے کہ ان میں سواری کے لائق کون ہے اور بوجھ اٹھانے کے قابل کون ہو سکتا ہے، اسی طرح صاحب قرآن بھی کائنات سے تعرض کرتا ہے، مگر اس کا مقصد اللہ کی قدرت اور اس کے علم و حکمت کا اظہار ہوتا ہے اس کے سوا اور کچھ مقصود نہیں ہے [2]۔

اس لئے قرآن مجید کے اصلی مقصد و عنوان پر نظر رکھنی چاہیئے۔ ہر نئی دریافت یا ہر نئی سائنس کی تحقیق کو اس سے خواہ مخواہ ثابت کرنے کی کوشش کرنا زیادتی ہے۔ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات آئے دن بدلتی رہتی ہے، آج سے دس سال پہلے یا پچاس سال پہلے جن باتوں کو سائنس دانوں نے ثابت کیا تھا آج ان کے بارے میں ان کی تحقیقات بہت کچھ بدل گئی ہیں، اسی طرح برابر ان کی تحقیقات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہیں، مگر قرآن مجید نے انسان کی سعادت اور بھلائی کے لئے جو حقائق پیش کئے ہیں، وہ ناقابل تبدیل ہیں اکبر نے صحیح ترجمانی کی ہے ؎

فلسفہ کی چناں و چنیں رہی
اکبر خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

انسان کا چاند پر پہنچنا ایک مسلمان کی نظر میں

اس تمہید کے بعد اب ہم اصل مسئلہ کا جواب دینا چاہتے ہیں، رہ گیا یہ سوال کہ کیا اسلامی تعلیمات نے چاند تک انسان کے پہونچنے کو ناممکن بتایا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں کہیں بھی نہیں فرمایا گیا ہے کہ انسان چاند تک نہیں پہونچ سکتا، بلکہ سائنس کی موجودہ ترقیات سے قرآن و حدیث کی بہت سی باتوں کی مزید صداقت ظاہر ہوتی ہے لیکن اس وقت تک چاند تک پہونچنے کی جو کوشش کی گئی ہے ابھی تک اس کا کوئی مفید پہلو سامنے نہیں آسکا ہے، بلکہ دو گھنٹہ چالیس منٹ چاند پر چہل قدمی کی قیمت امریکہ کو چوبیس کروڑ ڈالر ادا کرنی پڑے گی، معلوم نہیں کتنے غریبوں کا خون چوس کر یہ خلائی سفر کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال اگر آئندہ چاند کے سلسلے کی مزید معلومات انسان نے حاصل کر لی تو ہمارے یہاں ایک مسئلہ کی شاید اس سے مزید وضاحت ہو سکے،

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اللہ الذی خلق سبع سموات ومن الارض مثلھن (یعنی اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین بھی) (سورۃ طلاق)

[1] فوز الکبیر

[2] سلعات ص۶

قرآن مجید نے آسمان کے سات طبقات بیان کئے ہیں اور معراج والی حدیث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہر دو طبقہ کے درمیان کافی فاصلہ رکھا گیا ہے اور اس کی تائید میں بہت سے دلائل موجود ہیں۔ البتہ زمین کی پیدائش کے سلسلے میں یہ پہلو قابل غور ہے کہ یہاں آیت میں کس حیثیت سے تشبیہ دی گئی ہے، آیا فقط پیدائش میں تشبیہ ہے یا عدد میں بھی! جن لوگوں نے فقط پیدائش میں تشبیہ مانا ہے ان کے قول کو کمزور قرار دیا گیا ہے جمہور مفسرین کے نزدیک عدد میں تشبیہ دی گئی ہے گویا آسمان کی طرح زمین کے بھی سات طبقات ہیں، مگر ہمارے مشاہدہ میں صرف وہی زمین آسکتی ہے جس پر ہم رہتے ہیں بقیہ زمین کے طبقات ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں، عام طور پر مفسرین نے یہی کہا ہے کہ بقیہ زمین کے طبقات ہماری اس زمین کے نیچے ہیں، اور یہ سب باہم ملے جلے ہیں۔

مگر بعض روایات و آثار کے پیش نظر مفسرین نے اس کا بھی اظہار کیا ہے کہ ممکن ہے کہ زمین کے طبقات میں بھی باہم فاصلہ رکھا گیا ہو، جیسے آسمان کے طبقات میں فاصلہ ہے۔ چنانچہ جامع ترمذی کی ایک روایت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، جو حضرت ابوہریرہؓ نے مرفوعاً نقل فرمایا ہے:

"وان بین کل ارض وارض خمسمائۃ عام"[1]

ہر زمین سے دوسری زمین کا فاصلہ پانچسو سال کی مسافت کا ہے۔ یہ بھی پیش نظر رہے کہ یہ پانچ سو سال کا فاصلہ کس اعتبار سے فرمایا گیا، اس کی تعیین نہیں فرمائی گئی ہے، حضرت مولانا حکیم الامت اشرف علی تھانویؒ نے سورہ طلاق کی مذکورہ آیت کے ترجمہ کے ساتھ ترمذی شریف کی روایت کا ترجمہ نقل فرمایا ہے۔

اس کے فوائد میں تحریر فرماتے ہیں۔ اس سات زمینوں میں احتمال ہے کہ نظر نہ آتی ہوں، اور یہ بھی احتمال ہے کہ نظر آتی ہوں، اور لوگ ان کو "کواکب" سمجھتے ہوں، جیسا کہ مریخ کی نسبت بعض کا گمان ہے کہ اس میں جبال و انہار و آبادی ہے، اور حدیث میں جو ان زمینوں کا اس زمین کے تحت ہونا وارد ہے، وہ باعتبار بعض حالات کے ہو، اور بعض حالات میں وہ زمین اس سے فوق (اوپر) ہو جاتی ہوں، تفصیل بحث کے لئے تفسیر روح المعانی دیکھئے۔ صاحب روح المعانی نے یہ احتمال بھی ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ کرہ قمر وغیرہ کی مزید تحقیقات کے بعد وہاں زمین ثابت ہو، اور اس طرح زمین کے تعدد پر حس و مشاہدہ کی بھی گواہی ہو جائے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہر زمین پر اللہ کی ایک مخلوق آباد ہے اس کا صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔[2]

بہر حال سات زمینوں سے مراد یہ زمین اور چھ اور سیارے بھی مراد لئے گئے ہیں جن میں چاند و مریخ بھی شامل ہے، اس کے ساتھ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہ روایت بھی سامنے رکھی جائے تو مزید تائید ہوتی ہے فرمایا اگر میں تم لوگوں کے سامنے اس آیت کی تفسیر بیان کروں تو تم لوگ میری تکذیب کر دو گے۔[3]

بہر حال چاند پر سفر کی جو کوشش جاری ہے، اگر آئندہ اس میں مزید ترقی ہوئی تو ممکن ہے ہمارے مفسرین نے جو خیال آج سے بہت پہلے ظاہر فرمایا ہے اس کی مزید تائید و تفصیل کا اندازہ ہو جائے۔

(باقی)

[1] فتح الباری ج ۶ ص ۱۸۴

[2] روح المعانی ص ۱۲۷، ۱۲۵

[3] تفسیر طبری ص ۱۵۳

بقیہ "اداریہ"

اگر آدمی انتظار کرتا رہے کہ سب لوگ اجازت دیں اور کہیں کہ اب کچھ حرج نہیں تو وہ کبھی کوئی اہم قدم نہیں اٹھا سکتا اور عربوں نے ہر موقع پر کبھی اپنے آقائے اول امریکہ کو دیکھا اس کے بعد آقائے دوم روس کی طرف، اسی وجہ سے اتنی بڑی طاقت ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

بہر حال جو کچھ پیش آنا تھا آچکا، ہم کو اس کا سخت صدمہ ہے ہم ایک طرف یہ کوشش کر رہے ہیں کہ مسلمان بیدار ہوں، ان میں صحیح دینداری اور انابت کا جذبہ پیدا ہو، وہ اپنی غلطیوں کو مانیں اور مجرموں کو پہچانیں، ہماری یہ دعا ہے کہ اس امت میں پھر کوئی محمد الفاتح یا صلاح الدین پیدا ہو۔

دوسری طرف ہم ان لوگوں کی کوششوں کی تائید کرتے ہیں جن لوگوں نے فلسطین کا قضیہ اپنے ہاتھ میں لیا ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کے دست و بازو میں طاقت دے اور ان کے عزائم میں پختگی پیدا فرمائے کہ وہ مسلمانوں کی اس حقیقی طاقت کو سمجھیں جس سے انھوں نے پوری دنیا فتح کی اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنتوں کو واپس لیا۔

اسی طرح ہم یہ بھی دنیا پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بیت المقدس میں ہمارا حق ہے اور دنیا کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا خود یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا جب تک کہ یہ امانت مسلمانوں کی تولیت میں نہ ہو، مسلمان اس امانت کے سبب سے زیادہ حقدار ہیں وہی اس کا حق بے کم و کاست ادا کریں گے اور ہر مذہب کے ماننے والوں کو ان کی مذہبی تعلیمات کے مطابق اس مقدس مقام سے اظہار عقیدت کی اجازت دیں گے۔

"یروشلم"

..... لیکن اٹھ کھڑے ہوئے، انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا، ۱۷۶۶ء میں بغاوتوں سے معذور ہو کر اسٹامپ ایکٹ منسوخ کیا گیا اور ۱۷۶۷ء میں درآمدی مال چائے اور گلاس وغیرہ پر ٹیکس لگائے، بغاوت بھڑکی تو ۱۷۷۰ء میں بوسٹن کی آزاد افواج اور برطانیہ کی شاہی فوج میں مقابلہ ہوا، ۱۷۷۲ء میں انگلستان کے خلاف بوسٹن میں تحریک بغاوت شروع ہوئی، دسمبر ۱۷۷۳ء میں آزاد افواج نے بوسٹن بندرگاہ پر انگریزی وسٹ انڈیز کے جہاز کو جو چائے سے بھرا ہوا تھا غرق آب کر دیا، یہ واقعہ بوسٹن پارٹی کے نام سے ہنوز معروف ہے۔ ۱۷۷۴ء میں برطانیہ نے بندرگاہ بند کر دیا۔ انگلستان سے مزید فوج پہونچی، جنگ آزادی چلتی رہی ۱۷۷۴ء میں کانگرس وجود میں آئی جس کے فیصلہ کے مطابق انگریزی مال کا عدم تعاون ہوا۔ شاہ برطانیہ نے کالونی کو باغی قرار دیکر اس کی ناکہ بندی کر دی۔

(باقی)

تعمیر حیات میں اشتہار دے کر اپنی تجارت کو فروغ دیجئے

کتاب و سنت کے علوم اور زمانۂ حال کے امراء

از: مولانا عبدالرؤف خان جھنڈانگری

عربی کے ساتھ انگریزی علوم و فنون کی ضرورت دنیوی اعتبار سے

بنگال آسام ریلوے کے ایک اے، سی، ڈی او صاحب ہیں، انھوں نے اپنے مکتوب گرامی میں لکھا ہے کہ میں عربی تعلیم کو اور مروجہ نصاب کو غیر مفید پاتا ہوں میں مسلمانوں کے لئے ایسے عربی مدرسوں کو ضروری سمجھتا ہوں جنہیں علوم حاضرہ کے ساتھ ہی ساتھ علوم شرعیہ کی تعلیم ہو تاکہ صحیح معنی میں مسلمان انجینئر اور مسلمان ڈاکٹر، مسلمان وکیل، مسلمان جج پیدا ہوں۔

الجواب میرے محترم کی یہ اسکیم بے حد مفید ہے اور تجویز یقیناً معقول ہے، مگر مدارس عربیہ کی حالت تو یہ ہے کہ "جامہ ندارم دامن از کجا آرم" یہاں عربی درسگاہوں میں اتنی سکت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اندر سے فارغ ہو لیں تو دنیوی پہلو پر خاص توجہ دے سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ عربی کسی اعلیٰ درسگاہ میں انگریزی اور دیگر زبان کے مختلف شعبوں کو پہلو بہ پہلو رکھ دیا جائے۔ یا میڈیکل کالج کا ایک شعبہ ہو، وہاں کا طالب علم علوم عربی کے ساتھ طبی، ڈاکٹری اور قوانین کا پورا پورا ماہر ایک مسلمان ڈاکٹر یا وکیل بن سکے، اسی طرح قانون کا ایک شعبہ رہے جہاں سے عربی دانی کے ساتھ ساتھ مسلمان وکیل و جج بن سکیں۔ اسی طرح فن انجینئری کا ایک شعبہ ہو تاکہ مسلمان طالب علم انجینئر بن سکے۔

بیشک صنعتی تعلیم کا یہ کورس اس قدر مفید ثابت ہوگا کہ اس عربک کالج کا ڈاکٹر یا انجینئر محض ڈاکٹر یا انجینئر نہیں ہوگا بلکہ اسلامی زاویہ نگاہ کو جذب کرنے کے سبب اور دیندارانہ فضا اور اسلامی ذہنیت میں نشو و نما پانے کے سبب ایک پختہ مسلمان ڈاکٹر ہوگا جو صرف حق پر راضی یا حق کا طالب ہوگا۔

پس ایسے پختہ کار آدمی موجودہ عہدوں کو سنبھال لیں تو خلق خدا کو بڑا عظیم نفع ہو اور دنیا بڑی مصیبتوں سے نجات پا جائے۔ ضرورت ہے کہ کوئی ایسا کالج کھولا جائے جس میں عربی و شرعی علوم کو اصل قرار دیکر صنعتی و فنی تعلیم کے شعبوں کو فروغ دے کر اعلیٰ معیار پر چلانے کی انتھک جدوجہد کی جائے۔

صنعتی تعلیم بہر حال انگریزی زبان کے بین الاقوامی حیثیت کے پیش نظر جبکہ علم و فن کی زبان بھی انگریزی ہو گئی ہے، ڈاکٹری، انجینئری تعلیم، زراعتی و دوسرے صنعتی علوم کی تحصیل کے لئے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ انگریزی زبان اور دیگر علوم کو حاصل کیا جائے، اسی طرح سیاسی ضرورتوں کے پیش نظر بھی ضرورت ہے کہ دین و عقیدہ کے پختہ خیال لوگ انگریزی و دیگر علوم کی تعلیم اور نہایت اعلیٰ تعلیم حاصل کریں خواہ ایسے پختہ کاروں کی تعداد کتنی ہی کم ہو، مگر اعلیٰ پیمانہ کے تعلیم یافتہ ہوں اور بمنزلہ آسمان کے تاروں کے ہوں، جو وقت کی سیاست کو اور ملک کے مطالبات و مقتضیات کو سمجھ کر کونسلوں میں اسلام کی صحیح ترجمانی اور قوم کی صحیح سیاسی رہنمائی بھی کر سکیں، اور ..... مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے انقلابی و اصلاحی مجاہد اشخاص پیدا ہوں، مگر کسی سیاسی قیادت کا منزل مقصود وہ لیڈر متعین نہیں کر سکتا جو کسی یورپین، یا روسی اشتراکی، اصول کا پابند اور اسلامی ضوابط و کلیات سے آزاد ہو رہا ہے۔ اس لئے ہم اصول اسلام سے علم و شغف کی قید کو انگریزی تعلیم کے لئے ضروری ترین حصہ سمجھتے ہیں تاکہ اسی طرح ہر منصب پر دیندار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نظر آنے لگیں، اور عوام پر ان کی دینداری کا اثر پڑ رہا ہے۔ اگرچہ سیاسی واقفیت کے لئے بہت کچھ علوم و فنون کی شرط نہیں۔ سر سید احمد خاں کا دماغ اپنے وقت میں ایک بڑا سیاسی دماغ تھا مگر موصوف بہت انگریزی داں نہیں تھے مگر کتاب اسباب بغاوت ہند لکھ کر سیاست وقت کا مقابلہ اس عمدہ طریقہ پر کیا کہ وہ اپنی نظیر آپ ہیں۔

آج افسوس کی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا رجحان انگریزی علوم دنیویہ کی طرف ہے اور اس سے صرف ملازم گردی کی خواہش ہے اگر صنعتی تعلیم کی طرف توجہ ہوتی اور اس میں ترقی کرتے تو کیا خوب ہوتا، سیاسی قوانین و قواعد کو سمجھ کر ملک و قوم کی صحیح رہنمائی کا جذبہ ہوتا تو بڑا کام بنتا، مگر اب بجز ملازمت کے اور کوئی خاص خیال عام طور پر نہیں پایا جاتا، یہ سب پر روشن ہے، گاندھی جی، جواہر لال نہرو، مالویہ جی، پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ نے اعلیٰ علوم پڑھ کر گورنمنٹ کی ملازمت کا جذبہ نہیں رکھا، آپ کے محمد علی رحمۃ اللہ اور علامہ اقبال رح اور حیدر آباد کے بہادر یار خاں وقت کی سیاست کو بہت خوب سمجھتے تھے مگر کیا ان کے دنیوی علوم و فنون کا مقصد یہ تھا کہ کوئی شاہی ملازمت حاصل کی جائے (حاشا وکلا)

ہم خوشحال مسلمانوں سے اسی اچھے خیال کی امید رکھتے ہیں اور سرکاری مدارس کے نتائج لامذہبی اور بد اعتقادی سے عزیز طلبہ کی ذہنیت کو محفوظ رکھنے کی اپیل کرتے ہیں۔

ہم تو ایسے خوشحال مسلمانوں کے حال پر افسوس کرتے ہیں کہ جن کا مطمح نظر صرف دنیوی اعزاز و جاہ کی تحصیل رہ گیا ہے۔ اگر دنیوی اعزاز طلبی کے ساتھ دین کا سودا آپ کو مطلوب نہیں ہے تو مجھے خوف ہے کہ ہمارے امراء اس حدیث کے مصداق نہ ہوں جو صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی روایت سے اس طرح مروی ہے کہ دنیا میں بہت لوگ کھانے پینے سے فربہ ہیں مگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی مچھر کے برابر بھی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ پس لوگ دنیا میں کھانے پینے اور عزت سے بسر کرتے ہیں مگر عاقبت سے غافل ہیں، ان کی دنیوی عزت ان کے کچھ کام نہ آوے گی۔

خالص دنیوی تعلیم سے لامذہبیت پیدا ہوتی ہے۔ میرے خیال میں صرف انگریزی تعلیم یا دوسری دنیوی تعلیم اثمھما اکبر من نفعھما کی مصداق ہے، یعنی اس کا اخروی گناہ ان کے دنیوی اور مادی منفعت سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے، چنانچہ یہ بالکل ظاہر ہے کہ ایک مسلمان اور عامل قرآن کے نزدیک دنیا سے بھی قیمتی ایک شے ہے۔

جس کا نام دین ہے۔ خدا پرستی مذہب اسی دین قیم کا قیام اور اس پر عملدرآمد کا اہتمام ہے مسلمان کے نزدیک اگر تمام دنیا دین کے حوض مل جائے تو کچھ نہیں ہے لیکن اب اس دینوی و انگریزی تعلیم کا کیا اثر ہے؟

مسلمان ماں باپ انصاف سے اور خدا لگتی عینک سے دیکھیں کہ مذہبیت کی کوئی جھلک اور خدا پرستی سے کوئی لگاؤ نظر آتا ہے۔ مسٹر ہنٹر جو ڈبلو ڈبلو۔ ایل ایل ڈی۔ آئی ایس ایس کا خطاب پائے ہوئے ہیں تاریخ وہابیت سے متعلق اپنی کتاب میں ایک جگہ سرکاری تعلیم سے طلبہ کی لادینی پر دستخط کر چکے ہیں اور بے دھڑک کہتے ہیں کہ ہمارے سرکاری اسکولوں اور کالجوں سے کوئی نوجوان ہندو ہو یا مسلمان بے دینی سے بچ نہیں سکتا بلکہ آباؤ اجداد کی مذہبیت سے انکار کر سکتا ہے (ص ۲۰۲ بحوالہ صدق جدید ۱۵ جنوری ۱۹۴۵ء)

"مسلمانوں کا روشن مستقبل" کتاب اٹھائیے، اس میں بھی تاریخی حوالہ جات کے ساتھ اس امر کو متعین کیا گیا ہے کہ لارڈ میکالے، کا مقصد انگریزی تعلیم کے اجراء سے صرف یہ تھا کہ ہماری اس تعلیم کے مروج ہو جانے سے مذہب عیسوی خوب نشو و نما پا جائے گا چنانچہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا اثر مذہب پر براہ راست اتنا کافی بڑا کہ بقول لارڈ میکالے خون اور رنگ کے اعتبار سے تو طلبہ ہندوستان رہ گئے مگر مذاق اور فہم اور طریق فکر کے اعتبار سے یکسر انگریز ہوئے (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص ۱۲۴)

ایک اور انگریز نے کہا کہ بلاشبہ سب سے اہم فائدہ جو لوگوں کو ہماری زبان کے ذریعہ سے ملے گا وہ ہمارے مذہب کی معلومات ہوگی، اقبال نے سچ فرمایا:

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

اور روٹی کے لحاظ سے بھی تن پرست کا یہ خیال غلط ہے معمولی معمولی آسامیوں کے خالی ہونے پر ہزاروں درخواستیں بی اے، ایم اے والوں تک کی پہونچتی ہیں اکبر مرحوم نے اس پر جو کچھ لکھا تھا وہ آج بھی تازہ ہے ؎

کالج سے آ رہی ہے صدا پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

بہرحال اسلامیت اور مذہبیت تو الگ رہی اسلام پرست غازی داڑھی والے حاجی، لمبے کرتہ والے مولوی، اسلامی امور کے مفتی سب ہی ان کے لئے مضحکہ خیز بنے ہوئے ہیں۔

غرض اپنی قیمتی چیز دین کی قربانی دیکر اگر کوئی مادی چیزیں معاوضہ میں مل بھی گئیں تو کیا ہوا، حسب ارشاد قرآن کریم اتستبدلون الذی ھو ادنیٰ بالذی ھو خیر یعنی خیر اور اعلیٰ چیز دے کر حقیر اور کمترین شئے سے اس کے بدلے میں کس طرح لیتے ہو، اکبر نے خوب کہا ہے ؎

ترقی پاتے ہیں لڑکے ہمارے نور دین کھو کر
غضب یہ ہے کہ بھر لیتے ہیں تب جا کر بھکتے ہیں

یعنی اس علم میں حرارت دینی، عقائد اسلامی، اعمال شرعی، کی روشنی گل ہو جاتی ہے، پس ایک مسلمان کا لڑکا انگریزی علوم سے واقف اور اچھا خاصہ جنٹلمین ہے صورت پرستی اور اداکاری کی دنیا میں اُسے خوب باریابی حاصل ہے، لباس کے سنگار میں مہارت ہے زلف آرائی اور ہیٹ پالش کی بہار رکھتا ہے، کلبوں اور پارٹیوں میں اس کی آؤ بھگت ہوتی ہے، اور بالفرض اگر کسی عہدہ پر فائز ہو کر دنیا بھی کمانے لگا تو کیا ہوا، اگر اس کے ساتھ دینداری عنقا ہو گئی جو اصل چیز اور قیمتی متاع حیات تھی۔ اکبر مرحوم نے سچ لکھا ہے ؎

نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوش ہو اس کی کیسے کوئی جنٹلمین کہے

دیندار ماں باپ کا طرز عمل

صحیح حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان موجود ہے کہ جو ماں باپ اپنے بچوں کو قرآن کریم اور اسلامی تعلیم سے واقف کرا دیتے ہیں ان کے سر پر قیامت کے ہنگامہ دار و گیر میں ایسا نورانی تاج رکھا جائے گا کہ جس کی روشنی چاند اور سورج سے بھی زیادہ ہوگی۔

قرآنی تعلیم، یا اسلامی تعلیم، انگریزی یا دیگر دینوی تعلیم کا نام نہیں ہے دینوی تعلیم کا مطمح نظر، اسلامی احکام، فرمان خدا اور اقوال رسولؐ کی ترویج و تبلیغ نہیں ہے۔ لہٰذا اس پر کسی شرعی اجر و ثواب کا ترتب نہیں ہو سکتا اس لئے دیندار والدین اپنے بچوں کو اور ان کی آنے والی نسلوں کو سینچنے کے لئے عربی تعلیم دلاتے ہیں، تاکہ خود بھی وہ مورد حسنات ہوں اور بچے بھی باعث برکات ہوں، اگلے الدین کی چند واقعات سنئے۔

ایک واقعہ

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی مدیر "الفرقان" لکھنؤ نے اپنی ایک تازہ سرگذشت لکھی ہے اس میں یہ واقعہ درج کرتے ہیں مجھے اسلامی تعلیم کے بجائے انگریزی اسکولوں کی تعلیم و تہذیب بہت پسند آئی تھی مگر میرے ماں باپ بہت متشدد قسم کے دیندار تھے وہ ہرگز اس پر راضی نہ تھے میرے والد کے ایک دلی دوست تھے ایک دن ان کو سفارش پر اٹھوایا گیا، انھوں نے والد صاحب کے سامنے روشن پہلوؤں پر اظہار خیال کیا تو اس پر میرے والد نے یہ جملہ فرمایا جو اب تک کانوں میں گونج رہا ہے کہ اچھا اگر یہ انگریزی پڑھ کے ڈپٹی کلکٹر بھی ہو گیا تو میرے لئے کیا؟ اگر یہ نہیں تو اس کی اولاد کھڑے ہو کر پیشاب کرے گی انگریزی چال چلن گھر میں آ جائے گا مجھے اس سے کیا ملے گا۔؟

ایک اور واقعہ

مفتی مولانا محمد یوسف صاحب فرنگی محلی ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد سات سو روپیہ کے مشاہرہ پر انگریز کمشنر کے اصرار پر مقرر ہوئے ہیں، پیشکار ایک مسلمان منشی مقرر ہوا ہے شام کے وقت سرکاری کاغذات پر دستخط کرانے حاضر ہوا ہے، مسل نکلتی ہے، اتفاق سے ایک کاغذ سودی دستاویز نکل آتا ہے۔ آپ غصہ سے سرخ ہو جاتے ہیں اور کاغذات کو پھینک کر منشی کو روتا ہوا نکال دیتے ہیں، اور اس اقتدار پر لعنت بھیجتے ہیں۔

ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگلے ماں باپ آجکل کے ماں باپ جیسے نہ تھے وہ بیٹوں کو شوق نہیں دلاتے تھے بلکہ روکتے تھے وہ کہتے تھے ؎

لندن میں بگڑ جاؤ گے وسواس یہی ہے
تم پاس رہو میرے بڑا پاس یہی ہے

اور آج کے ماں باپ تن من دھن سے اس پر فربان ہیں بچوں سے زیادہ یہ خود ہی اس "معشوقہ" کے شکار ہیں..... تفاوت راہ از کجا است تا بہ کجا

اب تو ان باپ کے دل میں انگریزی تعلیم کی وہ فوقیت ہے کہ ان کا تمدن و تہذیب اور تعلیم و زبان سب انگریزیت میں غرق نظر آتی ہے کیسی دیندار شاعر کے یہ اشعار موجودہ حالات کے آئینہ دار ہیں۔

بقیہ مضمون صفحہ ۱۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

رائیہ کی حالیہ اسٹرائک

حضرت مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند۔ (یو۔پی)

دار العلوم دیوبند کی حالیہ اسٹرائک واقع ۱۲ر جولائی ۱۹۶۹ء کے اجمالی مگر جامع واقعات اور ان کے نتائج مجلس شوریٰ کے ایک مفصل بیان کے ذریعہ ملک کے سامنے آ چکے ہیں اور ان سے مخلصین دار العلوم کے بے چین قلوب بہت حد تک تسکین و طمانیت حاصل کر چکے ہوں گے۔

بلاشبہ دار العلوم کا غیر معینہ مدت کے لئے بند کر دیا جانا اور احاطۂ دار العلوم سے طلبہ کا نکلنا، اتنا ہی تکلیف دہ ہے جتنا کہ اسٹرائک اور طلبہ کی لاقانونیت کا واقعہ المناک تھا۔ مجلس شوریٰ نے اپنے بیان میں اصولی طور پر واقعہ کی اصلیت، نوعیت اور اس پر مرتب شدہ طبعی نتائج کی طرف واضح اشارات کر دیئے ہیں، جن سے اس سارے ہنگامہ کی اصلیت سامنے آ گئی ہے۔ البتہ سلسلۂ واقعات میں بعض اہم جزئیات ایسی بھی محسوس کی گئیں کہ جن کے منظر عام پر آ جانے سے دار العلوم اور اسکے کارکنوں کی پوزیشن صاف ہو کر سامنے آ جاتی ہے اور اسکے لئے ذیل کی چند سطریں لکھنے کی جانی ضروری خیال کی گئیں۔

اسٹرائک کا المناک امتیازی پہلو

اس اسٹرائک کا سب سے زیادہ المناک پہلو یہ ہے کہ طلبہ نے ابتدا ہی سے افہام و تفہیم کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے، اور کوئی صورت نہ تھی کہ طلبہ سے اسٹرائک اور اس ہنگامہ آرائی کی وجہ دریافت کر کے کوئی مناسب راہ عمل اختیار کیا جا سکے، انھوں نے ایسا کیوں کیا یہ وہی جانتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مرور زمانہ سے یہ راز بھی آشکارا ہو جائے، لیکن انھوں نے اپنے اس کھلے اقدام کی دعوہ اہتمام کے سامنے لانے سے مکمل گریز کیا۔

مطالبات دیئے بغیر اسٹرائک

اول تو مطالبات سامنے لائے بغیر ہی طلبہ نے تعلیمی مقاطعہ شروع کر دیا جو موجودہ اسٹرائکوں کے طرز و طریق کے لحاظ سے بھی ایک بے اصول اور بے بنیاد عمل تھا، جس کے معنی اس کے سوا دوسرے نہ تھے کہ دائرۂ اہتمام کی حد تک یہ اسٹرائک تھی۔ برائے مطالبات نہ تھی۔

اہتمام کی طلب پر بھی مطالبات نہیں دیئے گئے!

پھر دفتر اہتمام کی طرف سے خود مطالبات مانگنے پر بھی نہیں دیئے گئے۔ اور صفائی سے کہدیا گیا کہ "ادارہ اہتمام سے ہمارا کوئی مطالبہ نہیں بلکہ صرف مجلس شوریٰ سے ہے، اہتمام سے صرف ایک ہی مطالبہ ہے کہ وہ شوریٰ جلد سے جلد طلب کرے"۔ اگر بناء اسٹرائک یہی ایک مطالبہ تھا تو شوریٰ کے لئے دعوت نامے جاری ہوتے ہی یا کم از کم ارکان شوریٰ کے دیوبند پہونچ جانے پر اسٹرائک ختم ہو جانی چاہئے تھی لیکن ایسا نہیں ہوا جس کے معنی یہ ہوئے کہ تا مجلس شوریٰ اسٹرائک کا مقصد مطالبہ نہ تھا مقابلہ تھا۔ اس صورت میں گفت و شنید کی صورت ہی کیا تھی؟

دار العلوم پر قبضہ اور اساتذہ سے انقطاع

ساتھ ہی اسٹرائیکروں نے طلبہ کا اساتذہ سے تعلق منقطع کر دیا اور اسٹرائک سے اگلے روز دار العلوم کے تمام دروازے بھی اندر سے بند کر کے متعلقین کو ان پر طلبہ کے پہرے بٹھلا دیئے گئے اور پورا احاطہ اپنے قبضہ میں کر لیا جس سے سب اساتذہ اور کارکن باہر رہ گئے اور طلبہ اندر خصوصیت سے اساتذہ کو اندر جانے کی ممانعت تھی، اور اگر کسی استاذ کی قیام گاہ اندرون احاطہ ہونے کی وجہ سے اجازت بھی ہوئی تو اس شرط کے ساتھ کہ "وہ جیب چاپ داخل ہوں طلبہ سے تعلق ختم رکھیں" باہر جانے والے طلبہ کے لئے پرمٹ سسٹم جاری کیا گیا کہ "وہ بقید وقت باہر جا سکتے ہیں" کسی استاذ کو نہیں مل سکتے" اور کسی نے منٹوں کی بھی تاخیر کی تو اسے دھمکا کر سزا دی جاتی تھی، جس میں زدوکوب کے علاوہ قید و حبس بھی شامل تھا، کسی باہر جانے والے طالب علم کو انفرادی طور پر بھی کسی استاذ یا بڑے سے ملنے کی اجازت نہ تھی، اگر کوئی ملتا ہوا نظر آیا، یا جاسوسوں کے ذریعہ پتہ چلا تو اسے زدوکوب اور حبس و قید کی سزا میں دی جانے لگیں، اور ساتھ ہی ساتھ اندرون احاطہ ہمہ وقتی شور و غل، جلسے اور نعرہ بازی کا ہنگامہ بپا رہنے لگا۔

مسجد تک بند تھی کہ اوقات نماز میں بھی کیجا ہونے کی وجہ سے کوئی بات چیت نہ ہو سکے، ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں گفت و شنید یا افہام و تفہیم کا سوال ہی کیا پیدا ہو سکتا تھا، اور ہوتا بھی تو کس چیز میں جب کہ یہ سب کچھ تھا مگر مطالبہ یا شکایت راز دلوں پردہ ہی تھا تو اس کے بارہ میں کچھ کہنے سننے اور گفت و شنید کی گنجائش ہی کیا پیدا ہوتی ہے؟

مہتمم کیلئے باوجود اعلان کے دروازہ نہیں کھولا گیا۔

مہتمم کو اندرون احاطہ آنے کی اجازت تھی، مگر اس شرط کے کہ وہ تنہا آئے، بلکہ طلبہ نے خود آ کر بھی کہا کہ ہم بے چینی سے آپ کے منتظر ہیں، اور آپ کا پرجوش استقبال کرنا چاہتے ہیں مگر سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتا تھا اور یہی کہا بھی کہ میرا دار العلوم میں جانا فرضاً نہیں کام کے لئے ہے اور کام میرا تمام شعبہ جات سارے عملہ اور سارے اساتذہ بلکہ شہر کے بہت سے اہل معاملہ سے متعلق ہے جب وہ نہیں جا سکتے تو میں تنہا جا کر کیا کروں گا۔؟

میرے کان میں ڈالا گیا کہ اب طلبہ میرے تنہا آنے پر مصر نہیں رہے۔ اس لئے میں عملہ کے دس بیس افراد کے ساتھ دار العلوم میں جانے کے لئے مہمان خانہ سے اٹھا، اور دروازۂ دار العلوم پر پہنچ گیا، دروازہ بند تھا، انہیں کے ایک طالب علم نے دروازہ پر دستک دیتے ہوئے آواز دی کہ کواڑ کھولے جائیں، ۱۷۰، ۲۵۰، فٹ میں کھڑا رہا کواڑ نہ کھلے، آخر کار جواب یہ آیا کہ "مرکز سے اجازت نہیں ہے"

اس سے ان طلبہ کی ذہنیت کا اندازہ کر کے میں خاموشی سے واپس چلا آیا بہرحال افہام و تفہیم تو بعد کی چیز ہے، احاطۂ دار العلوم میں داخلہ اور عام طلبہ سے

ملنا ہی مشکل تھا، تاہم اہتمام کی طرف سے پھر بھی تفہیم اور پرسش کی بھی جاری رکھی گئی، اور اندرونِ احاطہ جاکر نہ سہی تو بھی وقتاً فوقتاً اسٹرائکی نمائندوں کو بلا بلا کر بھی کچھ نہ کچھ کہا سنا جاتا رہا۔ عجیب بات یہ ہے کہ طلبا اس ناکارہ پر بار بار اعتماد کا اظہار بھی کرتے رہے مگر بات ایک بھی مان کر نہ دی۔

منجانب مہتمم ایک اہم پیشکش

(۱) چنانچہ ۱۲ جولائی ۱۹۶۹ء کو سفر سے واپسی پر تقریباً آٹھ نو بجے صبح احقر نے ان کے ہم نمائندوں کو بلایا مگر نہیں آئے۔ بعد ظہر صرف دو طالب علم آئے، جبکہ ان کے پاس تحریر بھیجکر ان سے مطالبات معلوم کرنے کیلئے لکھا جا چکا تھا، اور جس جلسے میں تین اساتذہ کو (جو تحریر اہتمام لے کر گئے تھے) تحریر سنانے کا موقع نہیں دیا اور اساتذہ کو توہین آمیز انداز میں "واپس جاؤ، واپس جاؤ" کے نعروں کیساتھ واپس کر چکے تھے، ان دونوں ذمہ دار طلبہ سے منجملہ اور امور کے یہ کہا گیا کہ مقاطعہ تعلیمی سے پیشتر آپ کو مطالبات دینے چاہئے تھے تاکہ حدود اختیار مہتمم میں ان پر ہمدردانہ غور کیا جاتا۔ جواب یہ تھا کہ مطالبات آپ سے نہیں صرف شوریٰ سے ہیں۔ اور مقاطعہ تعلیمی بند نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ہمارا اتحاد اسی نعرہ پر مبنی ہے۔" سوال کیا گیا کہ "کیا آپ کے مطالبات اس وقت متفق علیہ ہیں" کہا گیا کہ "سب متفق علیہ ہیں۔" اس پر کہا گیا کہ "اب آسان صورت یہ ہے کہ آپ تعلیمی مقاطعہ ترک کر دیں۔ یہ اسی لئے تو ہے کہ مطالبات کے بارہ میں آپ کا اتحاد نمایاں ہو، تو میں خود مجلس شوریٰ میں یہ شہادت دوں گا کہ مطالبات سب متفق علیہ تھے، اس صورت میں بلا تعلیمی مقاطعہ کے بھی آپ کا یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے، اب آپ کو تعلیم جاری رکھنے میں کیا تامل ہے؟" مگر اس پر بھی طلبا اسٹرائک ختم کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اساتذہ سے بے تعلقی کی بدترین مثال

(۲) مولانا فخر الحسن صاحب اور مولانا انظر شاہ صاحب مدرسین دار العلوم نے جب کا توہین آمیز رویہ دیکھکر بطور نصیحت صرف یہ کہنا چاہا کہ مطالبات جو چاہو کرو، ہم اس میں دخل نہیں دیتے، لیکن اساتذہ کا احترام تو باقی رکھو، چنانچہ اس پر انہوں نے ۱۲ جولائی کو بعد مغرب مسجد میں مختصر الفاظ میں تقریر کی۔ تو اسٹرائکی سرغنوں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ درحالیکہ اس موقع کی اکثریت تقریر سننا چاہتی تھی، اور اسی وقت میرے پاس دو سرغنوں نے آکر کہا "کہ اساتذہ نے طلبہ میں ہنگامہ برپا کر دیا، ہم میں پارٹی بندی کرانی چاہی اور وعدہ خلافی کرکے ہمارے معاملات دخل دیا اور اسٹرائک سے طلبہ کو روکا۔" مگر اس کے چند منٹ بعد یہ مقرر اساتذہ طلبہ کے ایک مختصر مجمع کے ساتھ میرے پاس آگئے اور دریافت کرنے پر جواب دیا کہ ہم نے ایک لفظ بھی ان کی اسٹرائک یا مطالبات کے بارہ میں نہیں کہا۔ صرف استادی شاگردی کے رشتہ سے احترام اساتذہ کی نصیحت کی۔ دوسرے دن انہیں دو تین اسٹرائکی لیڈروں نے مہمان خانہ میں میرے سامنے آکر بطور استغاثہ یہی شکایت کی کہ "اساتذہ نے بدعہدی کی۔" اسی وقت ان ہر دو اساتذہ کو ان کے سامنے بلا کر دریافت کیا اور آمنا سامنا کرایا گیا، سات اساتذہ نے حلفیہ کہا کہ ہم نے ایک لفظ بھی مقاطعہ تعلیمی یا مطالبات کے بارے میں نہیں کہا، مگر اس پر بھی ان طلبہ نے ان اساتذہ کی تکذیب کی اور ان کے حلفیہ بیان کو بھی قبول نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں افہام و تفہیم ہوتا بھی تو کیسے اور اس کا اثر ہی کیا ظاہر ہوتا۔

مہتمم کا اتمام حجت :۔ (۳) لیکن پھر بھی احقر نے گفت و شنید جاری رکھتے ہوئے ۱۴ جولائی ۱۹۶۹ء کو اسٹرائکی سرغنوں میں سے دو مدعیانِ ذمہ داری کو بلا کر کہا کہ میں اپنے دل کی ایک صاف بات کہنا چاہتا ہوں، شاید آپ قبول کر لیں اور وہ یہ کہ "اساتذہ کی بے حرمتی حرمان و خسران کا سبب ہوتی ہے، خواہ استاد کسی بھی درجہ کا ہو، یا اس پر استادی کا نام ہی آگیا ہو، اس لئے آپ اساتذہ کے بارے میں تحریراً اس توہین پر ندامت و افسوس کا اظہار کر دیں، اور جتنی شکایات ان سے ہیں ان کو مجھ پر ڈال دیں، میں مجلس شوریٰ میں ان کو اپنی بدنظمی پر محمول کرکے ان غلطیوں کا اقرار کر لوں گا۔ تو یہ آپ کے اور آپ کے مقاصد کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ثابت ہوگا۔ اور اگر آپ مقاطعہ تعلیمی بھی ترک نہ کریں تو یہ اقدام ضرور کر لیں اس سے کم از کم دار العلوم کی شاندار روایات پر تو داغ نہیں لگے گا۔" لیکن طلبہ نے اسے بھی نہیں مانا۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے ایک بات بھی عام طلبہ کے کانوں تک نہیں پہنچی صرف دو تین افراد ہی بیچ میں رہتے تھے، جب اہتمام کی تحریر "طلب مطالبات" بھی انہوں نے طلبہ کو نہیں سنانے دی۔ تو ان زبانی باتوں میں ان سے ترجمانی کی کیا توقع ہوتی، چنانچہ انخلاء دار العلوم کے دوسرے دن مہمان خانہ میں جمع شدہ مجمع طلبہ میں جب میں نے یہی باتیں سنا کر ان سے پوچھا کہ کیا یہ باتیں آپ تک پہنچیں، اور ان نمائندوں نے بتلائیں تو سب کا جواب نفی میں تھا۔

بہرحال اہتمام و تفہیم کا گرے سے گرا درجہ بھی انہیں گوارا نہیں ہوا۔ اور بدستور اپنی ضد پر قائم رہے۔

طلبہ کا مجلس شوریٰ پر بیک وقت اظہار اعتماد و بے اعتمادی

یہاں تک کہ مجلس شوریٰ آگئی اور وہی شور و غل ہنگامہ آرائی، نعرہ بازی اور بندش احاطہ قائم رہی۔ مجلس کو البتہ یہ اجازت ضرور مل گئی کہ وہ اندرون احاطہ دار العلوم جلسۂ شوریٰ منعقد کرے مگر شرط یہ تھی کہ جلسہ ان ہی طلبہ کے زیر انتظام ہو اور دروازوں پر ان ہی کا پہرہ جو کہ بھی بدستور قائم رہے۔ مجلس کے وقار کے لحاظ سے یہ شرط انتہائی بیہودہ تھی، اس لئے مجلس نے اپنا جلسہ مہمان خانۂ دار العلوم میں منعقد کرنا مصلحت سمجھا۔

ان سرکش اور شرپسند طلبہ کو پڑھانے سے اساتذہ کا اظہار بے زاری

اور جب طلبہ کی یہ حرکت دیکھکر کہ وہ کھلے بندوں اساتذہ کے مقابلہ پر آگئے ہیں، اساتذہ کی تحریر بنام مجلس شوریٰ دفتر اہتمام میں موصول ہوئی کہ جب حالانکہ دار العلوم میں ہمارے داخلہ پر بھی طلبہ نے پابندیاں عائد کر رکھی ہیں، ہم سے بات تک کرنے سے طلبہ کو جبراً روک دیا ہے اور ہمارے خلاف نفرت و حقارت کا پروپیگنڈہ جاری ہے تو ایسے نااہلوں کے ہوتے ہوئے ہم طلبہ کو تعلیم دینے کیلئے تیار نہیں ہیں، ظاہر ہے کہ اساتذہ ان حالات میں عزت علمی کو پیش نظر رکھ کر اس طرز کے جواب میں ادا کرتے بھی کیا؟ بہرحال ان سرکش طلبہ کے طرز عمل اور ۶، ۷ اگر نے عام طلبہ کو نہ صرف انتظامی اور تعلیمی سلسلوں سے کاٹ دیا تھا بلکہ اساتذہ سے بھی کلیتہً منقطع کر دیا گیا تھا اور آخر کار اساتذہ خود بھی ان سے بے زار ہو کر الگ ہو گئے جو کسی نہ کسی حد تک ذریعہ افہام و تفہیم بنتے۔

مجلس آنے کے بعد بھی طلبہ نے مطالبات دینے میں بیجا تاخیر کی

اسی دوران میں مجلس شوریٰ آگئی اور ۱۷ جولائی سے اس کی نشستیں شروع ہو گئیں لیکن طلبہ کی طرف سے اب تک کوئی مطالبہ نہیں آیا، اٹھارہ کا بھی نصف دن گذر جانے پر مجلس نے ان طلبہ کو طلب کیا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہیں، تب ۱۸ کو شب میں ان کے تین نمائندوں نے زبانی شکایات پیش کیں اور تقریباً ۲ گھنٹے تک یہ شکایات بیان کرتے رہے۔ تب مجلس نے کہا آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ تحریر میں لکھ دیں۔ اس طرح تحریری شکایات و مطالبات ۱۹ کو صبح کے وقت ملے۔ باقی

فقہی مسائل

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین مسئلہ ذیل میں کہ ناولیں لکھنا کیسا ہے جبکہ اس کی اساس بے بنیاد اور ہوائی باتوں پر قائم ہے جبکہ ان واقعات کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا اس کو تو جھوٹ کے ضمن میں آنا چاہئے۔ کیونکہ یہ جھوٹ لفظی نہ سہی لیکن جھوٹ تحریری تو بہرحال ہے ہی۔ لیکن یہ بات پیش نظر ہے کہ ناولوں کا پڑھنے والا بھی یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اس کتاب میں ہے سراسر جھوٹ ہے۔ نیز اس کی آمدنی حرام ہے یا جائز۔ اگرچہ اس کو مصنف بہت ہی محنت اور کاوش و عرق ریزی کے ساتھ تیار کرتا ہے۔ اور ان ناولوں کا پڑھنا کیسا ہے جن سے جنسی جذبات ابھر آئیں۔ نیز اس کے برعکس کے پڑھنے کا کیا حکم ہے۔ بینوا و توجروا۔

الجواب

ہو المصوب۔ ناولیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک تو وہ ہوتی ہیں جن کا کوئی اصلاحی مقصد نہیں ہوتا۔ محض دلچسپی اور جنسی جذبات ابھارنے کا کام دیتی ہیں۔ مقصد حصول زر اور اپنی صلاحیتوں کا دوسروں پر اثر جمانا ہوتا ہے اور لوگوں کے اوقات کو بھی ضائع کرنا ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اس طرح کی ناولیں لکھنا اور پڑھنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے اور جو روپیہ ان کے ذریعے سے کمایا جائے وہ بھی طیب نہیں ہے، یہ لہو حدیث میں داخل ہے اس کا معاوضہ لہو حدیث والا معاوضہ ہے۔ اس کے برعکس جو ناولیں اصلاحی مقصد کے پیش نظر لکھی جاتی ہیں ان کو دلچسپ بنانے کی کوشش اس لئے کی جاتی ہے کہ لوگ اسے پڑھیں، اور مقصد سے قریب ہونے میں اس سے مدد لی جاتی ہے۔ خشک مضامین کو عام طور پر لوگ بالکل نہیں پڑھتے ہیں۔ اگر اس طرح کی ناولیں ہوں کہ اس میں عریانیت اور فساد اخلاق کی چیزیں یا اور کوئی غیر شرعی باتیں نہ ہوں تو درست ہے۔ ان کے ذریعہ جو روپیہ کمایا جائے گا وہ بھی جائز ہوگا، لکھنے والے بھی اپنی محنت اور مقصد کے اعتبار سے ثواب کے مستحق ہو سکتے ہیں بہرحال اس کا معاملہ نیت اور مقصد کے ماتحت ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب

محمد ظہور ندوی عفا اللہ عنہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ (۱) سر کے بالوں کو منڈانا افضل ہے یا بال رکھنا غالباً دونوں ہی چیزیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں لیکن اکثر آپ کا معمول کیا تھا، امید ہے کہ مفصل جواب عنایت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں گے۔ (۲) بغل۔ زیر ناف کے بالوں کو کتنے دن بعد صاف کرنا بہتر ہے اور کب تک گنجائش ہے۔ نیز مونچھیں اور ناخون کا کیا حکم ہے بینوا و توجروا۔

الجواب

حامداً و مصلیاً۔ مردوں کو تمام سر پر بال رکھنا مسنون ہے اور منڈانا بھی صحیح جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے حج اور عمرہ کے علاوہ سر کا منڈانا ثابت نہیں اور اکثر صحابہ کی عادت بھی یہی تھی، مگر امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ غسل میں مزید احتیاط کی وجہ سے اپنے سر کے بال منڈاتے تھے جو ان کے قول فمن ثم عادیت راسی سے صاف ظاہر ہے۔ چنانچہ مواہب میں ہے لم یروعن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حلق راسہ الشریف فی غیر نسک حج او عمرۃ فیما علمتہ فتبقیۃ الشعر فی الراس سنۃ و منکرھا مع علمہ یجب تادیبہ ومن لم یستطع تبقیۃ یباح ازالتہ (یعنی میرے علم میں حج اور عمرہ کے علاوہ حضور سے سر منڈانا ثابت نہیں ہے لہذا سر پر بال رکھنا سنت ہے اور منکر واجب التعزیر ہے اور جو شخص رکھنے کی استطاعت نہ رکھے اس کو منڈانا مباح ہے) علامہ ابن قیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ لم یحلق النبی صلی اللہ علیہ وسلم راسہ الشریف الا اربع مرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے (ہجرت کے بعد) چار مرتبہ سر مبارک منڈایا۔ عمرۃ القضاء۔ فتح مکہ۔ عمرۃ الجعرانہ۔ حجۃ الوداع انہیں چار مرتبہ سر منڈانے کا اتفاق ہوا جیسا کہ فتح الوسائل میں ہے۔ بعض فقہاء کا خیال یہ ہے کہ بال رکھنا بھی مسنون ہے اور منڈانا بھی مسنون ہے، چنانچہ عالمگیری میں ہے ان السنۃ فی الراس اما الفرق واما الحلق وذکر الطحاوی الحلق سنۃ ونسب ذلک الی العلماء الثلثۃ۔ (سنت سر کے بالوں میں مانگ نکالنا یا منڈانا ہے اور امام طحاوی نے ذکر کیا ہے کہ حلق سنت ہے اور اس کو امام صاحب اور صاحبین کی طرف منسوب کیا ہے۔ (۲) بغل اور زیر ناف کے بال ہفتہ وار صاف کرنا بہتر ہے ورنہ پندرہویں دن اور چالیس دن سے تجاوز کرنا ممنوع ہے۔ یہی حکم ناخون اور مونچھوں کا ہے چنانچہ مشکوٰۃ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وقت لنا فی قص الشارب وتقلیم الاظفار ونتف الابط وحلق العانۃ ان لا نترک اکثر من اربعین لیلۃ رواہ مسلم۔

فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔ خلیل احمد ندوی عفی عنہ

استفتاء

کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین مسئلہ ذیل میں کہ اللہ تعالیٰ شانہ خیر و شر دونوں کا خالق ہے یا فقط خیر ہی کا خالق ہے اگر دوسری صورت کو اختیار کیا جائے تو پھر اس اشکال کا کیا جواب ہوگا کہ شر کیلئے دوسرا خالق ہونا چاہئے اور اگر حق تعالیٰ دونوں کے خالق ہیں تو برائی کی نسبت (نعوذ باللہ) حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا لازم آتا ہے۔ امید ہے کہ جناب والا مفصل جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔ فقط والسلام

الجواب

ہو المصوب۔ حق تعالیٰ خیر و شر دونوں کا خالق ہے۔ خالق شر سے اللہ تعالیٰ کی طرف شر کی نسبت نہیں ہوتی ہے۔ شر کی نسبت بندے کی طرف ہے کیونکہ بندے کا کسب ہے۔ کسب کی وجہ سے بندہ گنہگار ہوتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ تلوار بنانے والے نے تلوار بنا دی اب جو غلط جگہ تلوار کو استعمال کرے گا وہ گنہگار ہوگا، تلوار بنانے والے کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ قاتل ہے قتل کی نسبت قاتل کی طرف ہوگی نہ کہ تلوار بنانے والے کی طرف۔ موجودہ عدالت بھی تلوار بنانے والے کو اس قتل کی بنا پر نہیں پکڑتی ہے، اسی طرح قتل کی کوئی نسبت شر بھی تلوار بنانے والے کی طرف نہیں کرتی ہے۔ فقط

محمد ظہور ندوی عفا اللہ عنہ

مسلسل

یروشلم

(از۔ خاور شناس)

ہزارہا سال کی بسی بسائی آبادی ایک پھونک میں اڑ گئی، نیست و نابود ہوگئی حتیٰ کہ نسلی خاتمہ ہوگیا دو ایک محض تاریخی یادگار کے طور پر نظر آجاتے ہیں، یہ سب کچھ کس سرعت کے ساتھ ہوا، تاریخ کا طالب علم سوچ بھی نہیں سکتے، امریکہ میں ۱۶۰۷ء سے مسیحی یورپ کے مذہبی مہاجرین کی آمد شروع ہوئی اور ۱۷۷۵ء تک براعظم کا نقشہ بدل گیا۔

عام روایات کے مطابق کولمبس نے امریکہ دریافت کیا، یہ نظریہ صحیح ہو سکتا ہے کہ یورپ کو اس کا علم سب سے پہلے کولمبس کے ذریعہ ہوا، ورنہ عرب یہاں کولمبس سے پہلے آئے اور کولمبس کی دریافت کے وقت دیگر آبادیوں کے ساتھ مسلم بھی یہاں آباد تھے، اب تو مغربی محققین کی نظر میں کولمبس خود مشکوک ہو چکا ہے اور ان دنوں یورپ میں یہ تحقیق جاری ہے کہ کولمبس سے پہلے یہاں کون آیا۔

۱۶ ویں صدی میں عیسائیوں کی آمد برائے نام ہوئی۔ ۱۶۰۷ء سے ۱۷۷۵ء تک آمد کا زور رہا، گنتی کے چند مذہبی مہاجرین یورپ کی مذہبی عدم رواداری سے تنگ آکر امریکہ آئے، بتاریخ اسپین، فرانس، انگلینڈ، نیدرلینڈ، سویڈن سے عیسائی آنے لگے اور نئی بستیاں (کالونی) آباد ہونے لگیں، اصل آبادی پر مظالم شروع ہوئے، قتل و غارت گری اغوا عام تھا۔ زمین و مکانات اور جائداد سے وہ محروم ہو گئے، یہاں کے اصل باشندے بالخصوص ریڈ انڈین بڑی بہادری سے لڑے لیکن دو خاص اسباب (۱) خانہ جنگی (۲) اسلحات کی کمی و کمزوری کی بناء پر زیر ہوئے۔ عیسائی متحد تھے اور اسلحات میں ان سے بالاتر تھے، بڑی جوانمردی و شجاعت سے لڑے بالآخر مغلوب ہو گئے۔

بارہ سالوں تک یعنی ۱۶۲۲ء سے ۱۶۳۴ء تک ریڈ انڈین بڑی شجاعت سے لڑے آخر شکست کھا گئے، اور وہ فطری جغرافیائی حدود جہاں نونہالان وطن فرحاں و شاداں اور شہلایان قبائل شادکام و بامرام زندگی گذار رہے تھے تاریخ کی کہانی بن گئی[1]۔ شاطر برطانیہ امریکہ کا آقا بن بیٹھا۔ اور اصل باشندوں کا نسلی اور ثقافتی خاتمہ کر دیا۔

ان تبدیلیوں میں کیا وقت لگا اور تاریخ یہ مسافت کتنے عرصہ میں طے کر سکی، اہم اور قابل غور مسائل ہیں، ۱۶۰۷ء میں سب سے پہلے انگریزی کالونی جنوب ورجینیا آباد ہوئی، ۱۶۲۰ء میں دوسری کالونی صوبہ مساچوسٹ میں آباد ہوئی، اس طرح ۱۷ ویں اور ۱۸ ویں صدیوں میں معتدبہ کالونیاں وجود میں آئیں، آخر کالونی ۱۷۴۳ء میں جورجیا میں آباد ہوئی، ۱۶۷۲ء سے ۱۶۷۴ء تک ڈچ اور برطانیہ کی جنگ جاری رہی، نیدرلینڈ کی ڈچ کالونی پر برطانیہ نے قبضہ کیا ۱۶۶۴ء میں نیو اسٹریا کی کالونی پر قبضہ کر کے برطانیہ نے اس کا نام نیویارک رکھا۔ ۱۶۷۳ء میں ڈچ نے اس پر دوبارہ قبضہ کیا لیکن ۱۶۷۴ء میں پھر کھو بیٹھے، سواحل بحر اوقیانوس کے سارے علاقے پر برطانیہ کے ماتحت آگئے۔ ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۳ء تک فرانس اور برطانیہ میں جنگ جاری رہی۔ کناڈ پر برطانیہ کا قبضہ ہوگیا ۱۷۶۳ء میں برطانیہ نے اسپین سے مشرقی اور مغربی فلوریڈا حاصل کر لیا۔

غرض اس قلیل عرصہ میں یہاں کے باشندوں کی مزارات پر عیسائی کالونیاں کھڑی ہوگئیں۔ تیرہ[12] کالونی میں اکثریت آبادی انگلستان اور آئرلینڈ کی تھی، مزروعہ زمینوں پر قبضہ کیا، اور نیو انگلینڈ اور مرکزی کالونی میں ۱۷ ویں صدی کے نصف آخر تک سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آگیا، غلام زمین کی کاشت پر لگائے گئے، سفید غلام یعنی غربا جو یورپ کے امراء کے ساتھ ان کے خرچ پر امریکہ اس شرط پر آئے تھے کہ جب تک سفر خرچ ادا نہ ہوگا وہ من حیث غلام خدمت کرتے رہیں گے۔ زمین کی آبادکاری کے لئے مامور کئے گئے، جنوبی امریکہ میں حبشی غلاموں کی تجارت عام تھی ۱۷ ویں صدی میں سب سے پہلے ڈچ والوں نے افریقہ سے کالے حبشی غلام لاکر ورجینیا میں تجارت شروع کی۔ تمباکو اور جوٹ کی کاشت شروع ہوئی، تمباکو سبھوں میں اہم تھا، مظالم اور جبریہ محنت کی وجہ سے کالے اور سفید غلاموں کی متحدہ بغاوت ہوئی۔

انگریز کالونیاں انگلستان کے زیر حکومت آگئیں، کالونی کی تجارت کو فروغ ہوا۔ انگلستان کے تاجروں سے مقابلہ (کمیشن) شروع ہوا۔ کالونی والے انڈیا اور وسٹ انڈیز کی مارکٹ پر چھا گئے، حاکم انگلستان نے اپنے تجار کی حفاظت کے لئے کالونی کے تجار پر پابندیاں عائد کیں۔ کالونی کے تجار کا کام محض انگلستان کے تاجروں کے لئے کچا اور خام مال فراہم کرنا تھا۔ ۱۷۵۰ء میں برطانوی حکومت نے احکام و قوانین نافذ کئے کہ کالونی کے تجار بیشتر اشیا بنانے کے مجاز نہیں تھے۔ کالونی کے تجار تمام قوانین کی خلاف ورزی کرتے رہے، سات سالہ جنگ (۱۷۵۶ء تا ۱۷۶۳ء) میں برطانیہ یورپ کی دوسری طاقتوں کے ساتھ الجھا رہا۔ اس عرصہ میں کالونی کی تجارت فروغ کرتی رہی۔ جنگ کے خاتمہ پر اقتصادی بدحالی کی وجہ سے برطانوی حکومت نے کالونی کے ٹیکس میں اضافات شروع کئے۔ ۱۷۶۳ء میں برطانیہ کی پارلیامنٹ اور شاہی فرمان کے ذریعہ زمین کی بندوبستی اور بساؤ کو روک دیا گیا۔ ۱۷۶۵ء میں معروف اسٹامپ ٹیکس کالونی والوں پر عائد کیا گیا۔

ان قوانین کے خلاف مقامی تجار نے بغاوت شروع کی، تحریک آزادی کی بنیاد پڑی۔ ۱۷۶۵ء میں انگلستان کے خلاف ایک سیاسی جماعت ابنائے حریت کی بنیاد پڑی۔ حرفت پیشہ مزدور کسان تاجر و سرمایہ داروں کی قیادت میں علم بغاوت

"باقی صفحہ ۱۰ پر"

[1] امریکہ کی سابقہ آبادی فطری جغرافیائی حدود معیشت و تجارت کے حالات، اے ایل۔ کروبر کی تصنیف شمالی باشندوں کے ثقافتی و فطری علاقے میں (مطبوعہ برکلے ۱۹۴۷ء) ملاحظہ ہو۔

کوائف دار العلوم

از
مولانا محمد عبد السمیع صاحب
ندوی

۱۰ و ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۸۹ھ مطابق ۲۴، ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامی کے جلسہ کی تاریخیں تھیں مندرجہ ذیل اراکین نے اس جلسہ میں شرکت فرمائی

(۱) مولانا عبد الماجد صاحب دریا آبادی مدیر صدق لکھنؤ (۲) مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۳) مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ (۴) مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب عثمانی ناظم ندوۃ المصنفین دہلی (۵) مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال (۶) مولانا مصطفیٰ کریم صاحب ندوی سی، ایم کالج دربھنگہ (۷) مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی صدر شعبہ دینیات جامعہ ملیہ دہلی (۸) مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدیر الفرقان لکھنؤ (۹) عالی جناب عبید الرحمن خاں صاحب شروانی رئیس حبیب گنج علی گڈھ (۱۰) مولانا عبد الغفار صاحب نگرامی ندوی مہتمم مدرسہ عربیہ بستی (۱۱) مولانا محب اللہ صاحب لاری ندوی (۱۲) مولانا مجیب اللہ صاحب مہتمم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ (۱۳) مولانا محمد اویس صاحب شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۴) شفاء الملک حکیم خواجہ شمس الدین صاحب لکھنؤ (۱۵) الحاج شیخ مستنصر اللہ صاحب بنارسی باغ لکھنؤ (۱۶) جناب اقبال حسن خاں صاحب صدر دینی تعلیمی کونسل بھوپال (۱۷) مولانا قاضی معین اللہ صاحب ندوی نائب ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۱۸) ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی لکھنؤ (۱۹) جناب اشتیاق احمد صاحب علوی بی، اے، ایل، ایل، بی وکیل لکھنؤ (۲۰) جناب سید اصغر حسین صاحب ایڈووکیٹ لکھنؤ (۲۱) جناب سید مصباح الدین صاحب نقوی معتمد مال ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس جلسہ کو اہمیت اس وجہ سے بھی حاصل ہوگئی تھی کہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی ناظم ندوۃ العلماء نے مسلسل علالت ضعف و نقاہت اور بعض دوسرے اسباب کی بنا پر نظامت سے علیحدگی کا خیال ظاہر فرمایا تھا جس کی وجہ سے حدود دار العلوم میں اساتذہ اور طلبہ نیز بیرون مدرسہ دوسرے اہل تعلق حضرات بے چین تھے اور ان میں اضطراب و انتشار تھا، یہ کیفیات کئی دن سے مسلسل چل رہی تھیں لیکن بحمد اللہ کہ اراکین مجلس انتظامیہ نے بڑے غور و خوض اور حالات کا سنجیدہ جائزہ لینے کے بعد جلسہ میں یہی فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا زید مجدہ مزید اختیارات کے ساتھ عہدۂ نظامت پر قائم رہیں، مولانا نے بھی جملہ اراکین کے متفقہ اصرار کے پیش نظر اپنی علیحدگی کے خیال سے رجوع فرما لیا۔ مجلس کے اس برمحل اور باموقع اقدام کے لئے منتظمین دار العلوم، حضرات اساتذہ کرام عزیز طلبہ سب ہی مجلس کے مشکور ہیں۔ فجزاءھم اللہ عنا خیر الجزاء۔

جمادی الاخریٰ کا پہلا اور اگست کا آخری عشرہ دار العلوم میں بڑی چہل پہل اور حرکت و عمل کا عشرہ تھا۔ ۱۰، ۱۱ جمادی الاخریٰ مطابق ۲۴، ۲۵ اگست مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء کے جلسہ کے دن تھے اس مرتبہ خصوصیت کے ساتھ قدیم فضلاء دار العلوم جو مجلس انتظامی کے رکن بھی تھے تشریف لائے تھے (۱) مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی مدیر معارف و ناظم دار المصنفین اعظم گڈھ سے (۲) مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب ندوی امیر دار العلوم تاج المساجد بھوپال سے (۳) مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی صدر شعبہ دینیات جامعہ ملیہ دہلی سے (۴) مولانا مصطفیٰ کریم صاحب ندوی (ایم، ایس سی علیگ ماہر نباتیات) پروفیسر سی، ایم کالج دربھنگہ سے (۵) مولانا عبد الغفار صاحب نگرامی ندوی مہتمم مدرسہ عربیہ بستی سے (۶) مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مہتمم جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے۔ جلسہ میں شرکت کے لئے پہلے سے پہونچ گئے تھے۔ مقامی حضرات میں سے (۷) مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی (ناظم ندوۃ العلماء) (۸) مولانا محمد اویس صاحب ندوی شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (۹) مولانا محب اللہ صاحب لاری ندوی پیشتر سے موجود تھے، آنے والے مہمانوں کا قیام نسبتہً طویل رہا اس لئے ان حضرات اساتذہ کرام اور طلبہ عزیز سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ مولانا مصطفیٰ کریم صاحب ندوی نے چھوٹے طلبہ کے ایک ہفتہ واری جلسہ کی صدارت کی اور مربیانہ طریقہ سے طلبہ کو خطاب بھی کیا، جس میں اپنی طالب علمانہ زندگی کے تجربات بھی بتائے، مولانا عبد السلام صاحب ندوی نے مختلف کاموں کی تفصیلات معلوم فرمائیں اور دلچسپی کا اظہار کرتے رہے، منتظمین کو مالیات کے سلسلہ میں قیمتی مشورے بھی دیئے۔

۱۱ جمادی الآخریٰ کو طلبہ نے اپنی انجمن "الاصلاح" میں طلبہ قدیم کے ایک بروقت نمائندہ اجتماع کے درمیان حضرات اساتذہ کے ساتھ اپنے ان بزرگ مہمانوں کا خیر مقدم کیا، مولانا شاہ معین الدین صاحب ندوی نے جلسہ کی صدارت فرمائی، مولانا عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے اپنی تقریر میں خوشی و مسرت کے اظہار کے ساتھ دار العلوم کی ترقیات کو سراہا اور تعلیمی جد و جہد کے مختلف میدانوں میں دار العلوم کے بڑھے ہوئے قدم کی نشاندہی اور قدر افزائی کی۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی نے اپنی تقریر میں طلبہ کو ان کی کمزوریوں کی طرف متوجہ کیا اور جو اثناء طالب علمی طلبہ میں پیدا ہو کر ان کی تعلیم میں حارج ہوتی ہیں اور علمی ترقیوں میں مانع ہو جاتی ہیں انہوں نے اس سلسلہ میں دار الاقامہ کے اصول و ضوابط کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا۔

آخر میں مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی مدظلہ نے اپنی تقریر میں طلبہ کو اپنے اندر خلوص و امتیاز کے خصائص پیدا کرنے کی ہدایت فرمائی مولانا کی تقریر طاقت ور اور بہت موثر تھی، مولانا نے خاص طور پر اس تجربہ اور نکتہ کی طرف متوجہ کیا کہ اگر کسی شخص میں خلوص اور اس کے کام میں امتیاز پیدا ہو جائے تو دیکھا گیا ہے کہ دنیا نے ضرور اس کی قدر کی ہے اور ایسا شخص کبھی ضائع نہیں ہوا، مولانا نے طلبہ کو اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کی ہمتوں کو اس کے لئے ابھارا۔

اس جلسہ میں مولانا مصطفیٰ کریم صاحب ندوی نے طلبہ کے لئے مصباح اللغات کے چار نسخے کتب خانہ کو ہدیہ کئے۔ مولانا محمد عمران خاں صاحب ندوی نے